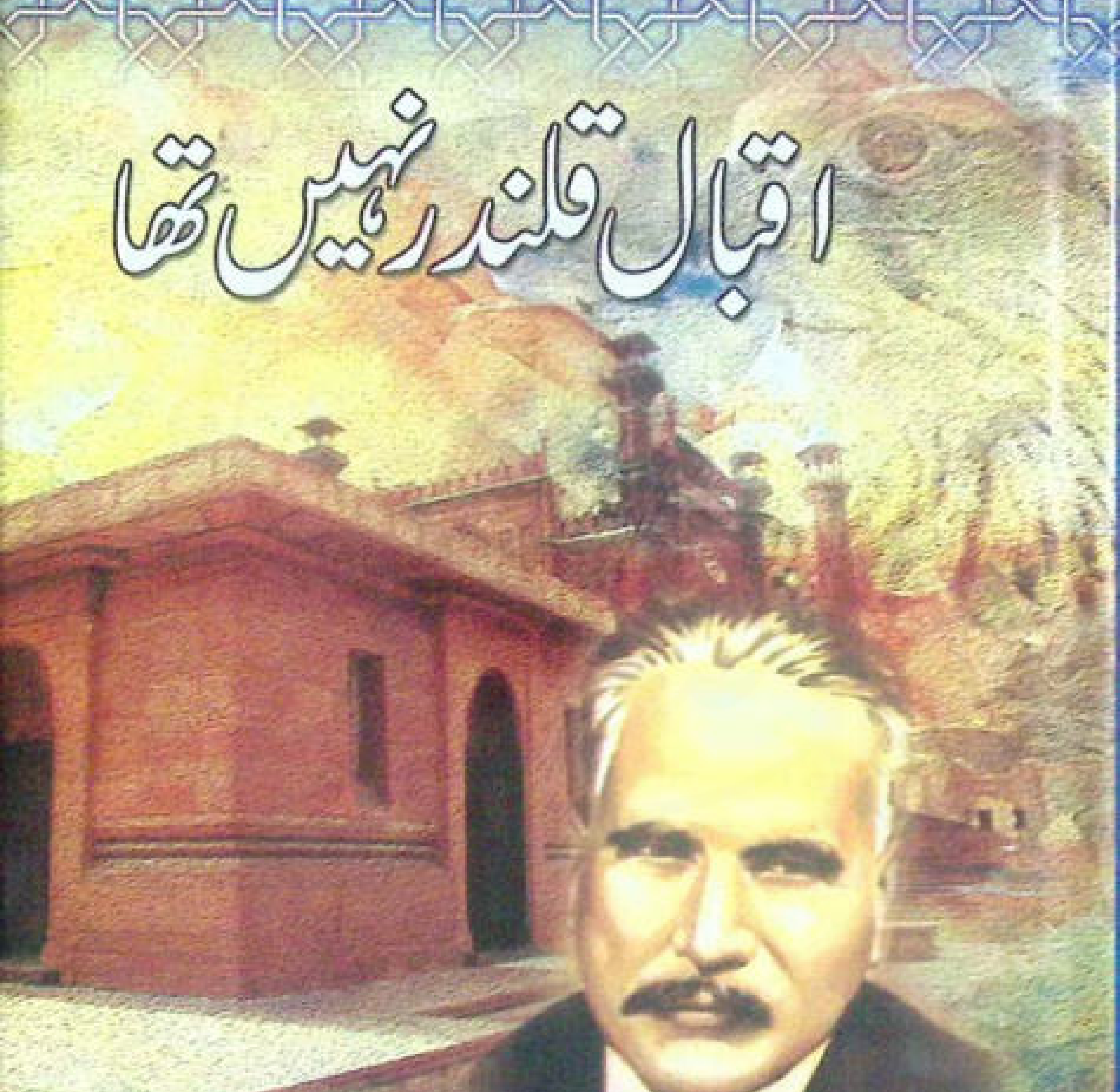
اقبال قلندر نہیں تھا



صاحب عاصمی

اقبال قلندر نہیں تھا

صائب عاصمی

ادارہ تحقیقات
اردو بازار کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	✧	اقبال قلندر نہیں تھا
مؤلف	✧	صائب عاصمی
ناشر	✧	ادارہ تحقیقات
اشاعت اوّل	✧	1967ء
طباعت	✧	الہلال پریس، لاہور
اشاعت دوم	✧	2019ء
صفحات	✧	128
قیمت	✧	-/400 روپے

ملنے کا پتہ:

بسم اللہ بک ہاؤس

اردو بازار کراچی

خلیل ملک: 0312-2846175

اجمالی خاکہ

اس کتاب کو بارہ مختصر ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پیش لفظ کے بغیر

کوئی کتاب چھپے اور کسی ڈاکٹرز اور ایم اے پی ایچ ڈی یا کسی رسالے یا جریدے کے "مدیرِ شہیر" کے دیباچے کے بغیر چھپ جائے؟ توبہ صاحب یہ کیونکر ممکن ہے؟ ورنہ کتاب کی ادبی اور علمی مارکیٹ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ تو یار لوگوں نے بھی سوچا کہ آج تک بے حساب کتابیں شائع ہوئیں مگر کسی سے دیباچہ بھی تو نہ لکھوایا۔ اب اس کتاب کا فورورڈ (Forward) یا پیش لفظ کسی سے ضرور لکھوایا جائے تو صاحب! ہم نے ایک پروفیسر ڈاکٹرز اور پی ایچ ڈی سے رجوع کیا جن کے تقریباً ڈیڑھ سو عدد دیباچے مختلف مصنفوں کی کتابوں پر ہیں۔ مگر وہ کتابیں ردی یا کباڑیے کی دُکان ہی پر چند آنوں کے حساب سے بکتی ہوئی دیکھی گئیں۔ بہر حال اس قسم کے دیباچہ نگاروں کا پیش لفظ تو سند کی حیثیت رکھتا ہے خواہ کباڑیوں کی دکانوں ہی پر پڑی ہوں۔

ہم نے رسم توڑ دینے کی سوگند کھاتے ہوئے ایک دیباچہ نگار سے بے تکلفانہ عرض کر دیا کہ صاحب! آپ کو میری کتاب پر دیباچہ لکھنا ہے اور ضرور لکھنا ہے ورنہ میری بدنصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے؟ کہا مسودہ رکھ جایئے۔ ایک ہفتے کے بعد بعد دیباچہ سے لے جائیگا۔ یہ تو آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ اچھی کتابیں تو کسی دیباچے کی محتاج ہی کہاں ہوتی ہے مشک تو وہ ہے جو خود بولے نہ کہ عطار کی مدح سرائی کی محتاج ہو۔

ہم پروفیسر صاحب کی اس گفتگو سے باغ باغ ہو گئے اور حسبِ ارشاد مسودہ ان کے حوالے کر آئے۔ ایک ہفتے کے بعد گئے تو سچ مچ ایک عدد دیباچہ لکھا رکھا تھا چند رسمی باتوں کے بعد میں واپس آ گیا اور دیباچہ دیکھا تو حیرت کی انتہا ہو گئی پروفیسر صاحب نے مسودے کو پڑھا بھی تو نہیں تھا اور میرا مجموعہ کلام سمجھ کر روایتی انداز میں سولہ صفحوں کا دیباچہ گھسیٹ

مارا تھا۔ خیر میں نے انہیں نہ تو جتایا۔ ایک اور پیشہ ور قسم کے پاس اپنا مسودہ لے گیا اور اس میں جو کچھ لکھا تھا اس کی توضیح بھی کر دی گئی۔ آپ نے فرمایا آپ خود لکھ لائیں میں دستخط کر دونگا میں نے کہا بسر و چشم شکریہ ادا کر کے لوٹ آیا۔ اور اپنی رسم سوگند کو پھر سے جوڑنا پڑا اور یہ کتاب "اقبال قلندر نہیں تھا" بھی دیباچے کے بغیر ہی چھپ رہی ہے۔

اس موقع پر ایک بھولی بسری بات یاد آ گئی۔ راقم الحروف کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں مگر مادرِ فطرت کے ایک فطری لاڈلے فنکار کی حیثیت سے متحدہ ملک (انڈیا) کے تقریباً بھی قابلِ ذکر معیاری جریدوں اور رسالوں میں کلام چھپ کر اہلِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین وصول کر رہا تھا میں چاہتا؟ تو اختر شیرانی مرحوم میرے اولین مجموعہ کلام "چراغِ لالہ" پر بیک رومانی دیباچہ رقم نہ کر دیتے؟ یہ کیونکر ممکن تھا جو مجھ سے پیار کرتے تھے مگر میں نے اُسے کالی سیاہی کے ساتھ مختلف خوشنویس حضرات سے لکھوایا۔ تاکہ جو کاتب اسے چھپنے کے واسطے لکھے گا۔ اغلاط تو نہ کرے گا یوں ہی ہوا۔ میں اُس زمانے میں مشہور ترین پبلشنگ فرم میں بھی ملازم تھا اس فرم کا نام عطر چند کپور اینڈ سنز میکلوڈ روڈ لاہور ہے میں یہ خوشخط مسودہ اُٹھائے ہوئے شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا ان کا رسالہ شاہکار شائع ہوتا تھا تاجور صاحب نے مسودہ دیکھ کر کہا۔ آپ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ میں اس مسودے کے مندرجات "شاہکار" میں وقتاً فوقتاً شائع کراتا رہوں گا۔ اور ہر غزل نظم یا قطعے کے نیچے اپنی طرف سے ایک اداراتی نوٹ بھی سپردِ قلم کر دیا کروں گا۔ اس کے بعد اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی کر دیا جائے گا پھر آپ خود چھپوایئے یا کسی ناشر کے حوالے کر دیجئے۔ اُنہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا "میں آپ کو اپنے حلقہ تلامذہ میں شریک کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

ان کی باتوں سے خلوص نہیں جھلکتا تھا اس لئے میں کوئی عذر کر کے مسودہ واپس لے آیا۔ اور کسی سے دیباچہ وغیرہ لکھوانے کا مبہم سا خیال بھی چھوڑ دیا۔ میرا کلام تو "نگار" "لکھنو" معارف" "اعظم گڑھ" "مدینہ" "بجنور" "زمانہ" "کانپور میں بھی چھپتا تھا۔ اور تقریباً ملک کے بھی روزناموں، ماہناموں اور ہفت روزوں میں بھی۔ میں نے "چراغِ لالہ" کو کسی دیباچہ نگار کا

احسان اُٹھائے بغیر ہی چھاپ دیا اس کے شروع میں حالات و زندگی بھی تھے علامہ نیاز فتحپوری مولانا سید سلیمان ندوی، ابوسعید بزمی ایم اے، سید عابد علی عابد، حضرت احسان دانش، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، بابائے اُردو، مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر تاثیر وغیرہ نے بھی اس پر خلوص تبصرے لکھے۔

چنانچہ ۱۹۴۲-۴۳ء کے زمانوں کا انقلاب، نگار، اُردو، مدینہ، زمیندار، معارف، زمانہ وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے جو تبصرہ فرمایا تھا وہ اُن کی جوہر شناسی کا آئینہ دار تھا۔

زیرِ نظر کتاب کیا ہے؟ عام طور پر دیباچے یا پیش لفظ میں کتاب کے نفسِ مضمون کے متعلق ذکر کردیا جاتا ہے۔

مگر میں سمجھتا ہوں۔ کہ پڑھے لکھے لوگ اتنے بے شعور نہیں ہوتے کہ اُن کا شعور کسی دیباچہ نگار یا نقاد کی رائے کا مرہونِ منت ہو۔ اس لئے میں "اقبال قلندر نہیں تھا" کو محض تعلیم یافتہ طبقے کی فکر و نظر میں چھوڑتا ہوں۔ البتہ اتنا ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ یہ کتاب صبر و سکون کے ساتھ مطالعہ کرنے کے قابل ہے موجودہ دور کا نوجوان طبقہ نہ صرف صحیح مطالعہ کی افادیت سے محروم ہے بلکہ مُطالعہ کرنے کی تکنیک سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شہاراتِ قلم میں تحقیق و تجسس کا عنصر موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ "بوریت" یا اُکتاہٹ پیدا کردینے والی سطحیت ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارا تمام لٹریچر ایک نقالی اور جگالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اُن ادیبوں اور فنکاروں کے ادب پاروں اور شہکاروں کا مطالعہ کیا جائے جو سطحی علم رکھنے والوں کے نزدیک تو شاید گرانقدر ہو سکتے ہیں مگر میرے نزدیک ماخذِ فکری و شعری کی رو سے نقالِ محض ہیں۔

اقبال کے ماخذِ شعری

پہلے تو یہی سوچا تھا کہ "اقبال قلندر نہیں تھا" ہی کے دوسرے حصے کے طور پر "اقبال

کے ماخذ شعری" کتاب بھی شائع ہو جائے تو بہتر ہے مگر بعد میں دیکھا تو "اقبال کے ماخذ شعری" کتاب کا مسودہ ضخیم نکلا۔ آخر ہر زبان کے دانشوروں کے شعری ماخذوں کے ساتھ اقبال کے افکار عالیہ کا حوالہ بطور دلیل درج کرتا اور اُن پر تفصیلی روشنی ڈالنا پھر مختصر طور پر تجزیہ کرنا۔ یہ کام واقعی بہت دقت طلب تھا مگر کچھ عرصے کی شبانہ روز محنت' تجسس اور چھان بین کے بعد یہ کتاب تیار ہو گئی۔ اس کے لکھنے کا یہ مقصد نہیں۔ کہ اس کے بے لوث مطالعہ کے بعد کوئی یہ بات شدت سے محسوس کرے کہ اقبال اس کے بعد واقعی شاعر رضا ہے نہ حکیم الامت نہ مفکر بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دنیا میں کوئی فلسفہ کوئی خیال اور کوئی فن نیا نہیں۔ بلکہ ایک ہی شے زوال وارتقا کے فکری چکروں میں سے گذرتی رہی ہے جسے بھی حقیقت ناشناس لوگوں نے جدید کہا ہے اور بھی کچھ اس کے بعد "اقبال کے ماخذِ شعری" کتاب ہی چھپے گی۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کو محض سطحی طور پر پڑھنے کی بجائے اسے اُسی گہرائی کے ساتھ پڑھا جائے گا جس گہرائی سے اِسے لکھا گیا ہے۔

قلندر کے کیا معنی ہیں؟

قلندر کی رُوحانی اصطلاح کا اطلاق کن مردانِ حق پر ہوتا ہے۔ بہ مقام قلندری پر فائز ہونے کے لئے کن فطری جوہروں کی ضرورت ہے؟ مذاہب عالم کا قلندری مسلک سے کیوں کوئی تعلق نہیں؟ مردانِ قلندر کے فرمودات کی روشنی میں اقبال کی شخصیت پر کیوں لفظ قلندر کا اطلاق نہیں ہو سکتا؟ قلندر کا عظیم ترین خطاب کیوں سب کے لئے ممکن نہیں؟ دورِ شریعت اور دورِ قلندری کے نفسیات، تاریخی اور رُوحانی تجزیے سے ثابت کیا گیا ہے کہ دورِ شریعت شعور انسانی کی خامکاری کا اور دورِ قلندری شعور انسانی کی پختہ اور ارتقائی کیفیات کا حامل ہے اور ایسی دور کا تعلق دورِ قلندری ہی سے ہے مذاہب شعور انسانی کو مہذب اور ترقی پذیر بنانے کی تحریکیں تھے جو دورِ جہالت سے تعلق رکھتے تھے گویا خدا کا قیاسی نظریہ جہالت کی کوکھ سے جنم لیتا آیا ہے ورنہ انسان کامل (فوق البشر) ہی خالق کل ہے۔

لہٰذا ابتدائی ابواب میں بتایا گیا ہے کہ انسان کیوں اشرف المخلوق (FORE MOST)

ہے۔اس پر نفسیاتی اور سائنسی طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ثابت کیا گیا ہے کہ وقتاً فوقتاً انسانِ کامل کے ظہورات بھی عام جہالت انسانی کے مدِ نظر کامل حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ نہیں ہوئے کیونکہ مصلحت ماحولی ہمیشہ ملحوظ خاطر رہی ہے گویا وہ بزدل تھے یا اس طرزِ عمل نے حقیقت پر جاہلانہ فروعی اور منقول رسم ورواج اور علوم وفنون کا پردہ تان دیا حالانکہ منصور اور بایزید بسطامی جو عرفائے کامل تھے نسبتاً پوری صداقت شعاری کا ثبوت دیا تھا اور اپنی کبریائی کا بے باکی کے ساتھ اظہار کر دیا تھا اور اگر عوام الناس اور ان کے جاہل علماء وفضلا نے انہیں مستوجب تعزیر گردانا تھا تو یہ ان کی جہالت آبائی کا زندہ ثبوت ہے۔اس کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ

(۱) دورِ قلندری کب شروع ہوا؟

(۲) دورِ شریعت کے زوال پذیر ہونے کا کیا سبب تھا؟

(۳) اقبال کا فلسفۂ خودی ارفانِ حق کے علمی مطالعے سے ماخوذ ہے۔

(۴) اقبال قلندر نہیں تھا۔ کیونکہ اُس نے اپنے افکار کو مذہب کے متعصبانہ لباس میں پیش کیا ہے۔

(۵) اقبال کے اُن اشعار کی تشریح مسلکِ قلندری کی روشنی میں کی گئی ہے جن میں وہ اپنے آپ کو قلندر کہتا ہے۔

(۶) فلسفۂ وجودیت کیا ہے؟ اقبال اس فلسفے کو کہاں تک سمجھا ہے؟

(۷) اس دور میں توحید اور اشتراکیت کا نظریات اتفاق قلندر وقت کا مطمحِ مقصود ہے تو کیوں؟

(۸) "سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست" کے ضمن میں ایک رسمی اور منقول علم کے داعی اور اقبال پرست شخص کے ایک مضمون بعنوان "اقبال اور قلندریت" کا روحانی طور پر تجزیہ کیا گیا ہے جو ماہنامہ "اقبال" لاہور میں چھپا تھا۔ آخری دو ابواب "لٹریچر" اور "ترقی پسند لٹریچر" محض اندراج کیے گئے ہیں دراصل اقبال کو سمجھنا بھی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ کیونکہ اس کے افکار عالیہ میں فکر و نظر کی انتہائی رفعتوں کے علاوہ خیال و ادراک کی بلند ترین

تجلیات بھی ہیں۔ میرا ذاتی دعویٰ ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لئے بھی عملی روحانیت اور رُوحانی فکر و دانش کی ضرورت ہے اُسے سمجھنے کے لئے ایم اے پاس کرنے کی ضرورت ہے نہ پی ایچ ڈی کرنے کی بلکہ روحانی علم و دانش درکار ہے۔

میں اقبال کو قلندر نہیں مانتا۔ مگر اُسے بہترین شاعر اور مفکر سمجھتا ہوں۔ اگرچہ اس کے اشعار و افکار بھی مختلف قوموں، مذہبوں اور زبانوں کے دانشوروں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ کوئی فن یا علم بھی تو تخلیق اور نیا نہیں۔ جتنے کی صحائف سماوی بھی پیشواؤں ہی کی تعلیمات کا عکس ہیں جن میں گذشتہ کتابوں کے حوالے تک موجود ہیں۔ ہم اقبال کو کیونکر رد کر سکتے ہیں؟

کتاب "اقبال قلندر نہیں تھا" کی تصنیف کا باعث میرا عملاً روحانی مشاہدہ ہے میں رُوحانیت کو کسی رجسٹریشن اجارہ داری اور حلقہ بندی سے منزہ مشاہدہ کرتا ہوں۔ جو لوگ مافوق الادراک قوتوں سے کام لے کر بے شعور یا اپنے سے کمتر نوعِ انسانی پر متصرف ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے گلے میں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر شامل کر لیتے ہیں نیز لوگوں پر حرکات و عادات سے قابض ہو جاتے ہیں اور انہیں حقیقی سربستہ راز جتانے کی صلاحیت عطا کرنے سے عمداً گریز کرتے ہیں اور بدستور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرنے میں لگے رہتے ہیں وہ لوگ میری نظر میں بدترین مجرم ہیں۔ کیونکہ اس شعوری ارتقاء کے دور میں جو فی الواقع ایٹمی دور ہے ایسے لوگوں کا چراغ ٹمٹما کر ہمیشہ کے لئے بجھ جانے کو ہے۔

ایٹمی دور کا انسان مجسم معجزہ اور کرامت ہے جو میڈیکل سائنس کے تجربات کا نچوڑ ہے اور مسیح کی طرح مُردوں کو زندگی دے رہا ہے اس کے پاس سوئی کی طرح تابکار روشنی ہے شہر کا ایک سوئچ آن کر کے پورے شہر کو جگمگا دیتا ہے چند سیکنڈ میں زمان و مکان کا سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر لیتا ہے اس کے پاس آواز سے زیادہ تیز رفتار راکٹ ہیں۔ وہ ایک سیکنڈ میں کُل دنیا میں اپنی آواز پہنچا دیتا ہے اور اس کی آواز ایک بڑِ اعظم کی سرحدوں کو چیرتی ہوئی باقی تمام بر اعظموں تک سنائی دے جاتی ہے وہ سینکڑوں میل سے ہم کلام ہو جاتا ہے وہ موت پر قابض ہونے کی تدابیر عمل میں لا رہا ہے وہ بیماریوں پر غالب آ گیا ہے ہر روز

ئنوں کا غذ تھوڑے سے وقت میں چھپ جاتے ہیں جو قوم تحقیق و تجسس کے ارتقائی شعور سے محروم ہو جاتی ہے وہ دھرتی پر ایک نا قابلِ برداشت بوجھ بن جاتی ہے مسلمان قوم نے جو پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگانے میں مشہور ہے گذشتہ کئی صدیوں سے کوئی ایجاد نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم شعوری ارتقاء سے محروم ہو گئی ہے چنانچہ اس کا ادب دیکھ لیجئے اس کے اخبار رسالے اور جریدے سے ملاحظہ کر لیجئے اس کا ادبی و شعری سرمایہ آنکھوں کے سامنے ہے نقالی اور تقلید اس قوم کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور بزعم خویش خلاقی ختم ہے

میری باتیں ہمیشہ صداقت کی علمبردار ہوتی ہیں اور صداقت کا اظہار ہمیشہ تلخ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے مادی طور پر کوئی ترقی نہیں کی جبکہ میرے معاصرین حکومت کی اونچی کرسیوں پر بھی متمکن ہیں اور اشاعتی اداروں پر بھی متصرف ہیں اور گرانقدر تنخواہیں بھی حاصل کرتے ہیں اور بیش بہا معاوضے بھی وصول کرتے ہیں۔

مگر میں خونِ جگر پیتا ہوں محض اس لئے کہ مجھے خوشامد تملق اور چاپلوسی کا فن نہیں آتا۔ اور نہ اسے اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ بے شعور اور جاہل لوگ اس کتاب کو نشانہ حسد بنائیں گے مجھے بعض اصحاب نے جو میری روحانی عظمت سے واقف نہیں ہیں مشورہ دیا ہے کہ ان لوگوں کے مطلب کی کہا کروں۔ کیونکہ یہ لوگ اس وقت خداوندانِ معاشرت ہیں مگر میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ اس لئے میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے وہ بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیا ہے میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا۔ سب کو دوست سمجھتا ہوں لیکن حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر میرے دوست بھی حق گو ہیں تو وہ میری اس فطرت کی یقیناً تعریف کریں گے۔

جو میرا دشمن ہے وہ اپنا دشمن ہے اپنے مقدر کا دشمن ہے جو لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہو چکا ہے وہ جانتے ہیں کہ صائب عاصمی سے دشمنی کرنے کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟

صائب عاصمی

ایم۔ اے (نفسیات)

قلندر

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک
ترک دنیا ترک عقبیٰ ترک مولا ترک ترک

اقبال نے نہ صرف لفظ قلندر کو اپنے کلام میں کثرت سے استعمال کیا ہے بلکہ اپنے آپ کو مرد قلندر کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا۔

مثلاً:

قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اور حافظ شیراز کہتا ہے۔

ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

اقبال نے فکر و نظر کی جن رفعتوں پر جلوہ افروز ہو کر قلندر کی اصطلاح کو بے دریغ استعمال کیا ہے اس کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں میں ممکن ہے بیشتر اس لفظ کی حقیقی معنویت سے بے خبر ہوں۔ کیونکہ اقبال کی ذہنی یا باطنی سطح پر پہنچ کر ہی اُس کے افکار عالیہ سے مستفیض ہو سکتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ سب قلندر ہوں یا لفظ قلندر کی معنوی سطح تک پہنچ سکیں۔ چونکہ اقبال کے مقلدین بھی اکثر اپنے اشعار میں قلندر کی اصطلاح استعمال کرنے کے مالیخولیا میں مبتلا ہیں۔ اس لئے راقم الحروف ان صفحات میں قلندری مسلک پر تفصیلی روشنی ڈالنے کا متمنی ہے آخر اس دور میں جس کے ساتھ اقبال کا خاص تعلق ہے بلکہ اس دور کی فطری ضرورتوں نے اقبال کو جنم دیا تھا اُس نے کیوں اپنے آپ کو ایسا کہتے ہوئے قلندرانہ تو اخر کا اظہار کیا ہے؟

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

☆☆☆

دور قلندری

عجب من عشق تبریزم کہ گشتم شیفتہ بر خود
چو خود را خود نظر کردم نہ دیدم جز خداوند خود

دورِ شریعت میں ظاہری شریعت کی پابندی حکومتوں نے قانون کی حیثیت سے ضروری قرار دے رکھی تھی۔ مساجد میں باقاعدہ رجسٹر رکھے جاتے تھے اور علاقہ وار حاضری لگائی جاتی تھی جو شخص کسی نماز میں حاضر نہیں ہوتا تھا اُس پر حد مقرر کر کے مختلف سزائیں دی جاتی تھیں۔ جب حقیقی جذبہ عمل مفقود ہو گیا تھا اُس وقت سے یہ دستور برابر جاری تھا۔

چنانچہ اہلِ تصوف نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پیری مریدی کا رواج شروع کر دیا تھا خواہ کسی کو حقیقی سلوک حاصل نہ تھا وہ پیشوائی کا دعویٰ کر کے اپنے مریدوں کی خاصی تعداد جمع کر لیتے تھے چنانچہ ریاکاری کا بول بالا ہونے لگا تھا لیکن اس بات کے پہلو بہ پہلو حقیقی اہلِ تصوف بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ جو اس ریاکارانہ ماحول کو شدت سے محسوس کرتے تھے اور بعض اہلِ حقیقت نے ایسے پیروں اور صوفیوں کو اپنے کلام میں ہدفِ تنقید بھی بنایا ہے۔

حافظ شیراز کہتے ہیں۔

نقدِ صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد
اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

خرقہ ولبادہ اور صوف پہن کر فقرا اور مشائخ اہلِ حقیقت کی طرح ایکٹنگ کرتے تھے اور عام اُن کی اُس ظاہری ہیبت کذائی سے مرعوب تھے جنہوں نے بیعت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور مذہب کے نام سے لوگوں کو فریب دے دے کر شکم پرستی اور شکم پروری کی ہوس پوری کرتے تھے ان کے خرقے جلا دینے کے لائق تھے۔ کیونکہ وہ ریاکار اور منافق تھے

یہاں دو قسم کے متصوفین تھے ایک سجدہ ہجود کو کافی سمجھتے تھے اور انہیں عرفان ذات حاصل تھا نہ وہ سلوک کی منازل سے واقف تھے جس کا تعلق باطن سے ہے چنانچہ رومیؒ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

نماز زاہداں سجدہ ہجود است

نماز عاشقاں ترک وجود است

یہ ترک وجود کیا ہے؟ اپنے حواسِ خمسہ سے بے نیاز ہو جانا اور محسوسات و ظاہری کی طرف سے کلیتہً لاپرواہ ہو کر اپنے دل میں مستغرق ہونا جس کے بارے میں علامہ بھی کہتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

یعنی عرفان نفس حاصل کرلے کیونکہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے رب کو پہچان لیا۔ یا جو اپنا بن گیا۔ وہ خدا کا ہو گیا۔ یہ کیفیت سالک کو بے خودی، جذب اور شکر عطا کرتی ہے لیکن اس کیفیت کے حصول کی خاطر رہبر کامل کی ضرورت ہے عام انسان خیالات کا مرکب ہے اُس کا ذہن بے اندازہ مختلف اور متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا ہے اور خیالات محسوسات خمسہ کے ساتھ وابستہ ہیں جب تک محسوسات خمسہ پر قابو نہ پا لیا جائے اُس وقت تک خیالات کا جوالا مکھی پھوٹتا رہتا ہے یا یوں سمجھئے کہ ذہن انسانی جب تک ٹھہر نہیں جاتا۔ اور ایک نکتہ ابدی پر مرتکز نہیں ہوتا۔ اُس وقت تک اس آفتاب کی شعاعیں منتشر رہتی ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ جب سورج کی شعاعیں مرتکز ہو جاتی ہیں تو بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے ذہن انسانی کا بھی یہی عالم ہے یا یوں سمجھئے انسان کا دل پارے کی مانند ہے جب پارہ ٹھہر جائے تو اکسیر ہو جاتا ہے اور پارے کا ٹھہر جانا آسان بات نہیں۔

حواسوں کا چراغ انسان کے دل میں روشن ہے جس کی روشنی کوئی تاثیر نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس کی لو منتشر، بے ہنگم، بے ترتیب، فضول اور بے مصرف خیالات کے تند و تیز جھکڑ سے لرزاں رہتی ہے جن لوگوں نے نفسیات انسانی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ انسان کے باطن میں لاتعداد انمول خزانے ہیں یہ اور بات ہے کہ کوئی اُن کا سراغ نہ لگائے یا اُسے

ان کی خبر ہی نہ ہو۔ یہ خزانے کیونکر ہاتھ آ سکتے ہیں؟ یوں کہ وہ اپنی حقیقت سے باخبر ہو۔ دوراُسے کسی کامل راہنما کی دستگیری نصیب ہو۔ جس طرح تلوں سے تیل' پتھر سے سونا' دودھ سے گھی' شہتوت کے پتوں سے ریشم آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح باطنی دفینوں تک رسائی بھی کوئی سہل بات نہیں۔

ہر ذی فہم آسان سمجھ سکتا ہے کہ اہل ظواہر اور اہلِ حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایک تو حقیقت کی دہلیز تک رسائی حاصل کرنے کی تکنیک تک سے واقف نہیں اور ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جو عرفانِ ذات رکھتے ہیں باطنی دفینے مخلص سالک کو ہاتھ آ جاتے ہیں مگر وہ ان کی طرف سے بے نیاز ہوتا ہے اُس کا مقصد وحید ذاتِ حق سے مل کر دوئی ختم کرنا اور وصال ابدی کی مئے بے خمار کے سرور میں مستغرق رہنا ہے۔ اور جو لوگ ان باطنی خزانوں سے دل بستگی پیدا کر لیتے ہیں وہ راستے ہی میں رہ جاتے ہیں کیونکہ یہ باطنی مکشوفات اہل حق کی نظر میں بازی گاہِ مجاز کے کھلونے ہی تو ہیں۔

دورِ شریعت میں جن حضرات کو کامل سلوک حاصل تھا اُنہیں سخت تکالیف اور شدائد سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ لوگوں کے پاس تو صرف ایک کسوٹی تھی کہ وہ ظاہری شریعت کے پیمانے سے سب کو ناپتے۔ جو اُن کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ وہ ان کی نگاہوں میں معتوب تھا چنانچہ اسی وجہ سے جنید بغدادی کے طائفہ سے تعلق رکھنے والے بھی شریعت کی پابندی سے اس قدر اُکتا چکے تھے کہ شبلی اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں " کاش میں ہمیشہ بستر علالت ہی پر پڑا رہوں۔ تاکہ مجھے شریعت کی نماز ادا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے'' کیونکہ اُس زمانے میں بیماری ہی ایک ایسا عذر رنگ تھا جس کی رُو سے کسی کو مسجد کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا تھا۔ دراصل سلوک میں انسان پر جذب و سکر غالب رہتے ہیں۔ رومیؒ کہتے ہیں۔

بخدا خبر ندارم چو نمازی گذارم
کہ تمام شد رکوع کہ امام شد فلانے

بھلا جذب و سکر اور بے خودی جاوید میں رکوع و قعود قیام اور سجود کے علاوہ امام کو بھی کیا

خبر ہو سکتی ہے؟ کہ مولانا خود نہایت پریشان تھے۔

درحقیقت جب عرفانِ ذات کا لامحدود شعوری انسانی میں سے مفقود ہو جاتا رہا ہے تو قدرتاً برگزیدہ ہستیاں مصدر شہود پر آ کر اسے بیدار کرنے پر مامور ہوتی رہتی ہیں۔ عرفانِ ذات کے لئے مذہب و ملت اور قوم و ملک کی شرط نہیں۔ قرآن میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

(یہ تحقیقی بات ہے مسلمان ہو یا یہودی، نصاریٰ ہوں یا فرقہ صائبین میں سے ہوں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں اور روزِ قیامت پر اور نیکوکار (صالح) ہوں۔ ان کے لئے ان کا حق الخدمت (اجر) اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور ان کو کسی طرح کا خوف ہے نہ غم سورۃ البقرہ ۱/۸)

علامہ پرم ہنس سوامی رام راتھر (ایم اے) سے بے طرح متاثر تھے سوامی صاحب گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے اور سائیں تلسی داس کی اولاد تھے جنہوں نے رامائن کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ وہ کافی عرصہ تک فارمن کرسچن کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر بھی رہے ہیں۔ اسی عرصہ میں انہوں نے اپنا ایک رسالہ نکالا تھا جو اُردو میں تھا جس کا نام الف تھا علامہ سوامی صاحب کے لٹریچر سے کافی مانوس ہو چکے تھے ان کا اُس زمانے کا کلام بھی اس بات کی غمازی کرتا ہے چنانچہ بانگِ درا میں اقبال نے رام چندر جی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے علاوہ سوامی صاحب کی وفات پر بھی ایک حقیقت افروز نظم لکھی ہے جس میں آپ کہتے ہیں۔

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں ہوتی ہے لا اللہ کا

اقبال نے اس شعر میں فنا و بقا کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ دلِ آگاہ سے مراد یہ ہے کہ انسان علمِ ذات سے باخبر ہو۔ وہ خود آگاہی کی روشنی میں نفی ہستی کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ دلِ آگاہ ایک نعمت عظیم ہے۔ نفی ہستی کی مسلسل اور کٹھن جدوجہد کے بارے میں ایک عارف کہتے ہیں۔

ہر دم از ناخن خراشم سینہ افگار را
تا ز دل بیروں کنم غیر خیال یار را

اس شعر کو سوامی صاحب نے بھی اپنے سلوک میں کئی بار دوہرایا ہے بلکہ جب وہ تارک الدنیا ہو کر جنگلوں میں جانے لگے تھے تو اُن کی زبان پر تھا۔

عشق کے مکتب میں میری آج بسم اللہ ہے
دل سے کہتا ہوں الف لب سے نکلتی آہ ہے

نفی ہستی کی مہم کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے کاملینِ وقت نے مختلف طریقے اختیار کیئے ہیں۔ ابوسعید ابوالخیر کہتے ہیں:۔

راہِ تو بہر روش کہ پویند خوش است
کوئے تو بہر جہت کہ جویند خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست
ذکرِ تو بہر صفت کہ گویند خوش است

ابوسعید ابوالخیر کو اہلِ حقیقت میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے آپ کارِ قلندری کے بارے میں فرماتے ہیں۔

تا مدرسہ و خانقاہ ویراں نہ شود
ایں کارِ قلندری آساں نہ شود
تا ایماں کفر و کفر ایماں نہ شود
یک بندہ حقیقتاً مسلماں نہ شود

یہ ابوسعید ابوالخیر کئی بزرگوں کے مرشد بھی تھے۔ ان سے داتا گنج بخش بھی فیضیاب ہوئے ہیں۔

سوامی رام تیرتھ کی وفات پر جو نظم اقبال نے کہی ہے اس کا آخری شعر ہے۔

توڑ دیتا ہے بُتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

یہ شعر بھی فنا و بقا کا ترجمان ہے جب نیست ہستی پر فنا کی ضرب پڑتی ہے تو جھوٹی ہستی یا انائے باطلہ چکنا چور ہو جاتی ہے اور ہستی حقیقی یا انائے حقیقی ظہور پذیر ہوتی ہے فنا کا انتہائی مقام بقا کا ابتدائی مرحلہ ہے اور بقا کا انتہائی مقام انائے کبیرہ کی منزل آخریں ہے۔ اہل تصوف نے سلوک کی منازل مقرر کی ہیں۔

یعنی عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت، عالم لاہوت وغیرہ، عالم ناسوت کو عالم اجسام بھی کہتے ہیں جو جمادات نباتات حیوانات اور نوع انسان پر محیط ہے نوع انسانی ایک ارتقائی نوع ہے لیکن محض شکل وصورت میں انسان کی ہیئت اختیار کر لینے پر ہی انسانیت کی معراج موقوف نہیں۔ بلکہ انسان کا عالم ارواح میں شامل ہونا اس کی سچی انسانیت کا منتہا مقصود ہے جب سالک عالم لاہوت میں داخل ہوتا ہے تو اس کی معرفت، قدرت اور مسرت تکمیل پذیر ہو جاتی ہے چنانچہ آدمی کا انسان ہونا اور انسان کا سچا انسان ہونا ہی مقصد آفرینش ہے جیسا کہ غالب کہتا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سوامی لکھتے ہیں۔

”کوئی ہندو ہو یا مسلمان۔ پارسی ہو یا عیسائی دیدار حق اور وصال الٰہی اُسی وقت ہوگا جب نفسانی زندگی کی موت ہوگی اور یہی بات حضرت ابوسعید ابوالخیر نے بیان کی ہے۔

راہ تو بہر روش کہ پویند خوش است

دورِ شریعت کس نکتہ وقت پر اور کہاں ختم ہوا؟ یہ معین کرنا دشوار کام ہے مگر حضرت مہر بابا نے دورِ قلندری کے آغاز کی یہ ظاہرہ علامت بیان فرمائی۔ کہ جب کاملین وقت نے باوجودیکہ انہیں انتہائی سلوک حاصل تھا شریعت ظاہری سے دامن کشی اختیار کی۔ اور اس بنا پر دنیا انہیں سالک مجذوب یا مجذوب سالک کہنے لگی۔ اگرچہ وہ اپنے وقت کے قطب ہوئے ہیں۔ وہیں سے دورِ قلندری کا آغاز ہوا۔ یہ دنیا کے ماحول بے دینی کی ان کے مقدس وجود میں صدائے بازگشت تھی۔

پیراہن جنوں سے تن عشق ڈھک لیا
یہ اک طریق خاص ہے اخفائے رمز کا

یہاں لوگوں نے طریق قلندری کو ایک کامل ہستی سے منسوب کیا ہے جس کی ظاہری علامات اور خصوصیات رسمی مذہب سے بیگانگی اور وضع قطع میں چار ابرو کا صفایا کرنا کافی سمجھا گیا ہے مگر کسے خبر ہے کہ

ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجا ست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

حضرت بو علی شاہ قلندر نے خود صورت و معنی قلندری کی توضیح و تشریح یوں کی ہے۔

سر بہ ہند میستم دارم کلاہ چار ترک
ترک دنیا ترک عقبیٰ ترک مولا ترک ترک

ظاہر ہے کہ ترک دنیا کرنے والوں کو راہب اور یوگی کہتے ہیں۔ ترک عقبیٰ کے مسلک پر چلنے والے رہروان راہ طریقت اولیائے کرام ہیں۔ اور ترک مولا کی منزلت پانے والے شمس منصور کی مانند قم باذنی اور انا الحق کا شور اٹھاتے ہیں اور ترک ترک وہ کمال عرفان اور معراج فقیری ہے جس میں ہستی و نیستی کو ترک کرنے کے بعد بھی جو کچھ ترک کیا گیا۔ اس کا احساس و خیال بھی محو ہو جاتا ہے بالفاظ دیگر سب کچھ حاصل کرنے کے بعد وہ بیچارگی اور بندگی کامل میں دنیا کو پیغام حق سناتے ہیں اور انسان کو مقصد زندگی کے حصول کے لئے دعوت عمل دیتے ہیں یعنی قلندر فی البطن فارغ از تکلفات رسمی اور مستغنی از لزومات زندگی ہوتا ہے۔

تذکرہ غوثیہ (مصنفہ گل حسن قادری) میں غوث علی شاہ قلندر کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔

فقیری ایک بات ہے کان میں کہنے کی یا تو انسان ادھر تھا ادھر ہو گیا گویا آگ میں پھونک مار دی۔ اس کے لئے وقت و زمانہ درکار ہے نہ نماز روزہ اور نہ درود وظائف اور نہ مذہب و ملت کی شرط۔

اسی بات کو حافظ شیرازی بیان کرتے ہیں

در عشق خانقاہ خرابات شرط نیست
ہر جا کہ مست پر تو روئے حبیب است

پھر لکھتے ہیں:

مراد من زخرابات چونکہ حاصل شد
دلم ز مدرسہ کا نقاہ گشت سیاہ

بلھے شاہ پنجابی میں فرماتے ہیں

جس بھیر پایا قلندر روا
راہ کھوجیا اپنے اندر دا

بلھے شاہ علامہ سے تقریباً چار سو سال پہلے ایک عارف اور مرد قلندر گذرے ہیں جن کی پنجابی کا خیال اکثر خاص و عام میں مزے لے لے کر گائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ قلندر کا وہی مسلک بیان کرتے ہیں۔ جو ہر زمانے اور ہر زبان میں ہر جگہ مردان قلندر یکساں انداز سے بیان کرتے چلے آئے ہیں اگر چہ وہ لوگ جو مسلک عرفان و مستی سے باخبر نہیں۔ ان کے معانی کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

نہ خدا مست نہ مندر نہ اوہ خانہ کعبے
نہ خدا میں تیر تھیں ڈٹھا اینویں پنڈے جھاگے
نہ خدا قرآن کتابیں نہ وچ روز نماز سے
بلھا شاہ بیٹوں مرشد ملیا چھڈ ے سب تگادے

یہی وہ رموز و اسرار ہیں۔ جن کو جب عارفانِ حق نے برسر عام بیان کیا۔ تو ظاہر پرست لوگ انہیں تنگ کرنے لگ گئے۔ علامہ کہتے ہیں۔

شریعت کیوں گریبان گیر ہو ذوق تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

مشکوٰۃ (کتاب العلم) میں ہے۔

وقال حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم دعائين فاما احلاهما فبثثه فيكم كراما الاخر فلو بثثه قطع هذا العلوم يعنى مجرى اللعام رواه البخارى

ابوہریرہؓ نے کہا۔ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو تھیلیاں (علم) یاد کیں۔ ایک کو میں نے تم میں پھیلا دیا۔ اور اگر میں دوسری کو تم میں پھیلاؤں تو میری رگ گردن کاٹ دی جائے۔

(اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رموز معرفت ظاہر کرنا کس قدر مشکل بات ہے جبکہ جہالت اور بے خبری کی دلدل میں پھنسی ہوئی مخلوق سننا تک گوارا نہ کرے۔ اسی موقع پر شاہ نے کہا ہے۔

جے ظاہر کراں اسرار تائیں
بھل جاون سب تکرار تائیں
پھر مارن مینوں یار تائیں
ایتھے مخفی گل سو جیدی اے

اقبال کہتا ہے۔

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اور شاہ نے کہا ہے

پھڑ نکتہ چھوڑ حساباں نوں
کر دور کفر دیاں باباں نوں
دے پھوک حساب کتاباں نوں
کر صاف دے دیاں خواباں نوں
اک نقطے وچ گل مکدی اے

حافظ شیراز کہتے ہیں

فرحت شر طریقہ رندی کہ ایں نشاں
چوں راو گنج برہمہ کس آشکار نیست

مجھے اصغر گونڈوی کا شعر یاد آگیا۔

بس اتنے پہ ہوا ہنگامہ دار و رسن بر پا
کرے آغوش میں آئینہ کیوں مہر درخشاں کو

اس سر قلندری کو مولانا رومیؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

دارم اندر سینہ سر دو جہاں
کے تو انم ملیذ خاموش از زباں
صد ہزاراں قالب اندر سرہا
سر خود بے مصلحت گفتم ترا
ایں ہمہ اجزائے اعضائے من است
راست می گویم نہ ایں وہم و ظن است

قلندر کی شان بیان کرتے ہیں۔

مرد حق ازاد است از عبد و رب
بندگی بنداست و آزادی طرب

مرد حق کا مقام لاہوت ہے یعنی ترک ترک کا مقام بندگی اور عبودیت یا عبادت غلامی ہے قلندر ہر قسم کی غلامیوں سے آزاد ہوتا ہے کیونکہ غلامی خواہ وہ کسی کی بھی ہو آخر غلامی ہے۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ ''فتوح الغیب'' میں لکھتے ہیں:۔

ہر کہ بعد از شناخت و معرفت عبادت می کند تحقیق شرک می کند۔

ابو بکر واسطی نے کہا ہے

ایمان سبب نزدیکی خدا نیست و کفر موجب دوری از حق نہ۔

امام غزالی لکھتے ہیں:۔

فریضہ ما خند دلاؤ دن است و سنتیہ مارسول بوُدن۔

رومیؒ نے کہا ہے

مذہب عشق از ہمہ ملت جداست
عاشقاں را مذہب و ملت خداست

قلندر کی دعوت جب خاص ہوتی ہے قطب وقت دیتا ہے جب عام ہوتی ہے تو اوتار یا نبی یا رسول بن کر قلندر قدیم ہی دیتا ہے مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں۔

باید دانست کہ انبیاء علیہ الصلوٰۃ مجتبا اند کہ بقلاب جذب محبت کشاں کشاں ایشاں رامی برندو بے مشقت شاں بدرجات قرب می رسانند۔ انابت آن است کہ ریاضت و مجاہدات از برائے وصول بدرجات قرب الٰہی آنجا در کار اند ناچار راہ مریداں است و اختیار راہ مراداں مریداں بہ مشقت و محنت بہ پاہائے خودی روند مراداں را بہ ناز و نعم می برندو بے محنت شاں بدرجات قرب می رسانند۔ باید دانست کہ ریاضت و مجاہدہ شرط راہ انابت اسلت در راہ اجتبا مجاہدات شرط نیست۔

ترجمہ: "معلوم ہوا کہ انبیاء علیہ الصلوٰۃ وہ انتخابی خصوصیت رکھتے ہیں کہ جنہیں قلاب جذب محبت سے کھینچ لئے جاتے ہیں اور انہیں بغیر مشقت و زحمت درجات قرب الٰہی عطا ہوتے ہیں درجہ انابت میں ریاض و مجاہدہ قرب الٰہی کے لئے لازمی سمجھے گئے ہیں حصول مقصد کی طرف متوجہ ہونا مریدوں کا طریقہ ہے اور مراد و مقصد کے لئے پسند کیا جانا مجتبا ہستیوں کا خاصہ ہے۔ مریدوں کو اپنی ذات مشقت و محنت سے اپنے قدم اُٹھانے پڑتے ہیں اور مراد مندوں کے قدم اُٹھائے جاتے ہیں۔ اور بلا جد و جہد درجات قرب الٰہی سے سرفراز کئے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ انابت کے درجہ میں ریاض و مجاہدہ شرط ہے اور راہِ اجتباہ میں مشقت و مجاہدہ کی چنداں ضرورت نہیں۔"

ہر زمانے میں رسالت کا نتیجہ شریعت ہے نہ کہ شریعت کا نتیجہ رسالت قلندری ریاض یا مجاہدہ وہ جو نبیوں نے اپنے ظہور سے پہلے اپنی تنہائیوں اور خلوت گزینوں میں اپنے اُوپر عاید کیا اس کی غایت و غرض کا ذرہ بھر علم بھی دنیا کو نہیں ہو سکتا۔ اور علمائے ظاہر بین کو اس کی ہوا تک نہیں لگ سکتی۔ ان ہستیوں ریاض و مجاہدہ ذاتی ترقی و روحانی بیداری کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا اثر باطنی طور پر عالم ناسوت و ملکوت پر یکساں روحانی فیض رسائی کا حامل ہوتا ہے جس انداز عقل انسانی سے بعید ہے۔

طرفہ تر ماجرا یہ ہے کہ عوام جنہیں قلندر کی حقیقت کا ذرا پتہ نہیں۔ کہتے ہیں جب نماز

پیغمبروں کو بھی معاف نہ ہوئی۔ تو گنہگار بندوں کو احکام شریعت کی پابندی سے کب چھٹکارا مل سکتا ہے؟ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ایک ادنیٰ جماعت کا طالب علم ایک ایم اے پاس اسٹوڈنٹ کا ممتحن بنا دیا جائے۔ جو اُسے اپنی دانست کے مطابق پرکھنا شروع کردے۔ اس قسم کی تعلیم عوام کو کس قدر گمراہی پر آمادہ کرنے والی ہے؟

☆☆☆

دورِ شریعت

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں

یہ دورِ شریعت کی نمایاں غفلت آگیں علامتوں میں سے ہے جس نے ظاہر پرستی کے زعم میں باطنی تنظیم و ترتیب سے بے اعتنائی اختیار کی۔ اخلاقی قوت' ہمدردی اور اُخوت عالمگیر کا خاتمہ کر دیا۔ مکر و ریا اور فریب و دغا کو فروغ بخشا۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں نماز ادا کرنے سے تمام فرائضِ انسانی کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ سب سے زیادہ خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہر داری نے نام نہاد پیروں اور مرشدوں کے لئے رُوحانیوں میں کھپنا اور بلا خوف انکشاف و رسوائی کھیتی اُگانا آسان کر دیا اُن سے کہا گیا کہ اگر کوئی آسمان پر اُڑے اور پانی پر چلے تو اُسے ولی نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس بات کا منشاء یہ تھا کہ وہ رہبانیت کے خطرناک کوچے میں اُلجھے رہنے سے محفوظ رہیں۔ کیا اس محتاط تعلیم کی غرض و غایت کو علماء نے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی؟ مصلحت اس تنبیہ میں یہ تھی کہ کوچہ طریقت میں جب تک کوئی کامل راہ نما نہ ملے۔ حضرتِ انسان کو حدِ شریعت ہی میں رہ کر اس خوش آیند گھڑی کا منتظر رہنا چاہئے تا کہ مقصدِ رُوحانی اور اس کے مدارج سلامتی اور آسانی سے طے ہوں۔

مگر مذکورہ بالا تنبیہ کے یہ معانی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ ہوا پر اُڑنے والے اور پانی پر چلنے والے انسان کی ایک ہوس پرست زاہد کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں۔ یہ کرتب اپنے وجود میں پیدا کرنے والا انسان گو حقیقی منزل سے کوسوں دور ہے مگر اس کی جرأت عملی اور منزلت میں روحانی سے از روئے انصاف ایک زاہدِ خشک اتنا ہی دور ہے جتنا انگور سے لنگور۔ اگر ایک ہوائی جہاز پر اُڑ کر آگ برسانے والا انسان زیادہ معجز نما ہے تو رہبانیت میں اپنی خفیہ قوتوں اور قدرتوں کو قبل از وقت بیدار کرنے والا انسان کیوں قابلِ تعزیر و تحقیر ہے؟

تاریخ اسلام اس ضمن میں شہادت پیش کرتی ہے کہ جوں ہی دین و مذہب کا خصوصی امتیاز جاتا رہا۔ اور تمام دینی و دنیوی مسائل کو اجتماعیت و اشتراکیت کے سانچے میں ڈھال کر خاص و عام کے لئے ایک ہی لاکلام نسخہ تجویز ہوا جو ہر مرض کی دوا قرار دیا گیا۔ وہیں سے دورِ شریعت کا آغاز ہوا گویا اسی میں تہذیب و تمدن کے تخریبی دور کا بیج بویا گیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے اس دورِ شریعت نے تدریجاً اور غیر محسوس طور پر باغِ اسلام کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔ بلکہ اس باغ کو متعصبانہ ناعاقبت اندیشانہ انداز سے کانٹ چھانٹ کر ایک بے رنگ و نمو گھاس کا تختہ بنا کر رکھ دیا۔

ماہرین نفسیات اس امر کا خلاصہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت انسان کی ذہنیت فطرتاً اوسط پسندی کی طرف مائل ہے جہاں بھی کسی مختلف فرد نے کسی شعبہ زندگی میں نہایت اُونچی قابلیت کا ثبوت دیا۔ تو فوراً شور و غوغا مچا کر اُسے رشک و حسد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس رُوحِ عصری کی تخلیقی و اختراعی قابلیت کا اعتراف در کنار اُس کے معاصرین نے اُسے جھٹلایا۔ اور اُسے اوجِ سر بلندی سے کھینچ کر اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ تاریخِ عالم میں بیسوں مثالیں نہ صرف مادی معاملات میں نظر آتی ہیں بلکہ مذہبی دنیا نے کچھ ایسے بدنما مناظر پیش کئے ہیں جنہیں سن کر یا پڑھ کر عقلِ انسانی حیران ہو جاتی ہے اور لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کا انسان اسلاف کے مقابلے میں زیادہ بیدار اور واقف کار ہے؟ جو صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اُن مجاہدین دین و ملت کے مزارات کی زیارت کرنا سعادت سمجھتے ہیں مگر یہ حقیقت چشمِ بینا سے پوشیدہ نہیں کہ حضرت انسان کے خمیر میں کچھ ایسی بات موجود ہے کہ وہ دوسروں کے تجربات اور غلطیوں سے فائدہ اُٹھانا نہیں جانتا کہ اسی متعذر الوقوع حماقت کی بناء پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

کہ تاریخ عالم خود کو دہراتی ہے جرمنی کے فیلسوف شوپنہاور کا فیصلہ ہے کہ:۔

"ہر زمانے میں اہلِ خرد نے وہی بصیرت افروز باتیں کی ہیں اور احمقوں کی اکثریت نے جن کی تعداد ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود رہی ہے ہر موقع پر اپنی نادانیوں کو دُہرایا ہے ازل سے یہی ہوتا رہا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا۔"

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات

والٹیر کا قول ہے کہ "ہم اپنی زندگی کے اختتام پر دُنیا کو اسی طرح احمق اور فاسق چھوڑ دیں گے جیسا کہ اُسے روزِ ازل پایا تھا"۔ کیا ان قبر پرست لوگوں کو خبر ہے یا وہ دانستہ انجان بنتے ہیں کہ انہی ہستیوں کو اُس وقت لوگوں نے کافر ٹھہرایا تھا۔ اور شریعت کا جامہ پہن کر اپنے آپ کو اور آئندہ نسلوں کو تیرگیٔ عقل اور جہالت روحی پر آمادہ تھا؟

حضرت انسان نے اپنی روشِ زندگی میں بارہا اس امر کی تصدیق کی ہے کہ اُسے کوئی شے اتنی صدمہ رساں معلوم نہیں ہوتی۔ جتنی کہ کوئی نیا اور جدت پسند خیال۔ کیونکہ روئے زمین پر ہر فرد جماعت نے اپنے ماحول سے اثر پذیر ہو کر یہی مان لیا ہے کہ اُس کا ذوق معاشرت' تمدن اور مذہب کے بارے میں نظریہ اور نکتہ نگاہ سب سے افضل و اعلیٰ ہے دوسرے شومئی قسمت سے نہ جانے کیوں گمراہ معتوب ہیں؟ اس لئے جب کوئی تعمیر پسند نکتہ یا انقلابی تخیل درپیش ہوتا ہے تو باوجودیکہ ان کا دل ضمیر بے ساختگی سے اس کی طرف کھنچا جاتا ہے پھر بھی اُن کی مذہبی غیرت ہمہ داری و ہمہ دانی اس امر کو گوارا نہیں کر سکتی۔ آج تک جس طرزِ زندگی کو وہ فیض اور اہل سمجھے ہوئے تھے کیا اس میں بھی رد و بدل کی گنجائش ہے؟ بہترین دماغ اس صدمے کی تاب نہ کر کے اس مجسم حقیقت سے انکار پر مجبور ہیں۔ اور طبقہ جہلا میں شمار ہوتے ہیں۔

خود علامہ نے کہا ہے

اندازِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

☆☆☆

اقبال اور مسلمان

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدہ عقل 'عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اقبال نے مسلمان قوم کو بیدار کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ نیا نہیں تھا اس سے پہلے مفتی عبدہ جمال الدین افغانی' سرسید' حالی اور کئی دیگر لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں وہی باتیں دہرائی ہیں اقبال جنہیں اپنے رنگ میں دہرا کر حکیم الامت کہلایا۔ اقبال نے لیبل یا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک کے طور پر انسانیت کو ایک پیغام دینے کا اسلوب اختراع کیا اس کے پیغام کی علت نمائی ماضی پرستی پرمبنی ہے حالانکہ انسانیت اس دور جدید میں کسی رجسٹریشن کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہر وہ شخص جس کا مطالعہ عمیق ہو۔ سمجھ سکتا ہے کہ اس کا فلسفہ خودی بھی مثنوی رومی کی خوشہ چینی ہے۔ البتہ وہ اپنی جودت طبع کے باعث خوشہ چینی کرکے مستفیض ہوا اور بہت حد تک کامیاب رہے لیکن چونکہ مذہب انسانیت کے عالم طفولیت کی یادگار ہے جو شعوری ارتقا کی ایک تحریک تھی لیکن طرفہ تر بات یہ ہے کہ جن کے ناموں پر مذہبوں کی داغ بیل پڑ گئی ان میں سے بیشتر یا باستثنائے چند اپنے طریق بیداری کو کسی نام کی رجسٹریشن سے لمٹیڈ نہیں کرتے لیکن بعد میں لوگوں نے ان کی شخصیتوں کا استحصال کیا۔ اور ہمیشہ ان کے ناموں سے مذاہب اختراع کرتے چلے گئے۔ حالانکہ یہ تحریکیں اپنے اپنے وقت میں ماضی پرستانہ ذہنیت کے خلاف ایک زبردست ردعمل کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر لوگوں نے جنہیں ان کے پیروکار ہونے کا دعویٰ تھا ہمیشہ ایک نہایت ذلیل قسم کی ماضی پرستانہ ذہنیت کا رنگ دے کر ان تحریکات کی بنیادی غرض وغایت کو کچھ اس طرح غلط ربود کر دیا۔ کہ یہ مذاہب بن کر رہ گئیں۔ جو رسوم ورواج اور مفروضہ وسینہ عقاید کا ایک بے معنی اور لغو پلندہ ہیں یا چیستان۔ بلکہ ان کے وسیلے سے سرمایہ داری' جاگیرداری اور

دیگر لا تعداد اجارہ داریوں کا فروغ قرار پایا بعض محرکوں نے بھی اپنے وقت میں مصلحت ماحولی سے کام لیا۔ اور غلاموں کنیزوں کی تجارت کو جائز و مباح قرار دینے کے ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ساتھ بھی مصالحت کرلی۔ حالانکہ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ ایسے نظام کے خلاف ہیں مگر چونکہ اُنہوں نے اپنی اجارہ داری کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے ایک خاص مذہب کی بنیاد ڈال دی تھی۔ درآنحالیکہ سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے ساتھ بھی مصلحت ماحولی کی آڑ لے کر یارانہ گانٹھ چکے تھے اس لئے اُن کے فوراً بعد یہ وقتی مصالحت از سرِ نو سلطانی یا پادشاہت کے رُوپ میں جلوہ گر ہوگئی۔ اور اقبال اسی شکوہِ خسروی کا حلقہ بگوشِ عقیدت ہے اگرچہ وہ ایک وقت میں اپنے آپ کو قلندر کہہ کر فخر محسوس کرتا ہے لیکن فطرتاً وہ چاپلوسی و جبلی کے رجحانات کا مالک تھا چنانچہ اس کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ اُس نے نہ صرف امراءِ حکومت اور اولیانِ ریاست کے ساتھ روابط قائم کئے بلکہ ایڈورڈ ہفتم کی شان میں قصیدے بھی لکھے اور ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر جو مرثیہ لکھا اس میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی ابتدا بالکل اسی طرح ہوئی تھی جس طرح کسی بھی اسمبلی کے ایک عام اُمیدوار کی ہوسکتی ہے۔ اس نے بھی ذاتی اقتدار کے حصول کی خاطر وہی گٹھ جوڑ کئے' داؤ پیچ کھیلے اور پاپڑ بیلے جو ایک کایاں قسم کا سیاست داں یا سیاسی آدمی اختیار کرتا ہے زمانہ طالب علمی میں وہ اوباش فطرت بھی رکھتا تھا پھر وہ پروفیسر بھی ہوا ہے اس کے بعد اُس نے ای اے سی کے امتحان میں ناکام رہنے کے بعد بیرسٹری بھی پاس کی۔ اور واپس لاہور آکر کچھ عرصہ تک پروفیسری کے ساتھ ساتھ لاء کی پریکٹس بھی کرتا رہا۔ مگر کچھ بننے کا شوق' انہماک کے ساتھ مطالعہ کتب' محنت اور مسلسل اُمنگ اور سب سے زیادہ عشقِ سخن نے اسے اور تو کسی میدان یا شعبے میں کامیابی عطا نہ کی۔ لیکن میدانِ شاعری میں سب سے گوئے سبقت لے گیا کیونکہ یہ ایک نفسیاتی بات ہے کہ انسان اپنے طبعی رجحان کے مطابق ضروری اسباب بھی مہیا کرتا جائے۔ یعنی اپنے فطری میلان کو زیادہ سے زیادہ پروان چڑھانے کے واسطے جس قسم کی مناسب محنت شاقہ کی ضرورت ہو۔ اُس پر کاربند رہے تو قدرت بخیل نہیں۔ کہ اُسے اپنے فطری جوہروں کو

نشو و نما دینے کے مواقع سے محروم رکھے۔ بشرطیکہ وہ اپنی شخصیت اور جوہروں کو پہچان نے میں کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ اقبال پروفیسری اور قانون پریکٹس سے سبکدوشی اختیار کر کے ہمہ تن مشاطگی سخن میں منہمک ہو گیا۔ اور اپنے ترانے کے مطابق اپنی پہلی کتاب کا نام بانگ درا رکھا۔ یہ سر کا خطاب بھی ایڈورڈ اور وکٹوریہ کی مدح سرائی ہی کا صلہ ہے۔

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

بانگ درا میں اس نے اپنا کلام میں شامل کرنے میں بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ ورنہ اس کا بیشتر کلام مدحیہ قصائد مراثی' عامیانہ قسم کے تغزل وغیرہ تک موقوف ہے جسے وہ خود ورد کر چکا تھا مگر اس کے جاہل اور اندھے ارادت مندوم سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر عوام کے سامنے پیش کر کے بزعم خویش علم وادب کا ایک تحقیقی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں حالانکہ ان کی یہ مساعی اقبال کی شخصیت کو حقیقت کی محک پر رکھنے والے ارباب بصیرت کے لئے سامان تنقید و احتساب کا کام دیتی ہیں حال ہی میں ایک رسالے کے مدیر نے ان خرافات کا ایک ضخیم مجموعہ "باقیات اقبال" کے نام سے مرتب کر کے شائع کرادیا ہے۔ جس کی قیمت دس روپے پچاس پیسے ہے چونکہ اس کتاب کی مدد سے تفصیلی حوالے درج کرنا محض تضیع اوقات ہے اس لئے اگر قارئین اقبال کی زمانہ ساز طبیعت کا مطالعہ کرنا چاہیں تو اس "مجموعہ خرافات" سے استفادہ کر سکتے ہیں وہ اقبال جو ایک سالک مجذوب (حافظ شیراز) کو زمانہ ساز ہونے کا طعنہ دیتا ہے حالانکہ حافظ نے مذہبی معاشرے پر جس انداز سے طنز کی ہے اس کی نظیر ایک اقبال کیا لاکھوں اقبال بھی پیش نہیں کر سکتے۔ حافظ کے کلام میں روحانیت کی ساتوں منزلوں اور مقاموں کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ رُوحانی منازل کا طے کرنا "اندر خود سفر کن" کا معاملہ ہے اس لئے عام خواندہ طبقہ بھی خواہ وہ شعراء ہوں یا ادباء ہوں یا علماء و فضلاء وغیرہ حافظ کی باطنی کیفیات اور اُن کی دل آویز ترجمانی کے حقیقی معانی سے حظ اندوز نہیں ہو سکتے اگرچہ ہر طبقہ اس کے کلام کو یکساں دلچسپی اور انہماک سے پڑھتا ہے حافظ شیراز کہتے ہیں:

محرم رازِ دلِ شیدائے خود
کس نمی بینم ز خاص و عام را

اقبال نے دُنیا جہاں کے دانشوروں' فلاسفروں اور شاعروں کا انہماک کے ساتھ مطالعہ کر کے اپنے نظریہ خودی کے لئے سواد اکٹھا کیا۔ اور اس سواد کو اپنے الفاظ میں اپنی قوم کے سامنے پیش کر دیا۔

چودھویں صدی کے اختتام کے قریب مسلمان قوم کا انحطاط فطری بات ہے کیونکہ ہر کمائے رازوالے کے پیش نظر اشیاء عالم ایک قانون ابدی سے وابستہ ہیں ۔ یہ ہمیشہ جہالت کا دور ہوتا ہے اور فطرت ہمیشہ زوال پذیر قوموں کو از سر نو بیدار کرنے کے لئے مختلف اور مناسب اوقات میں مختلف طریقوں سے کام لیتی ہے اقبال اس دور ہی کی فطری پیداوار ہے اُس کا ابتدائی کلام اُس کے اپنے دورِ جہالت ہی کا ترجمان ہے جب اس کے شعور اور وجدان نے تدریجی ترقی کی ۔ اُس نے نظریہ خودی کی اپنے انداز میں پرورش کی تا کہ اُسے اس نظریے میں خود اعتمادی اور یقین کا رنگ دکھائی دیا وہ اس کے جوز میں پھیلا ہو گیا۔ کیونکہ کوئی فنکار بھی شروع ہی سے پختہ کار نہیں ہو جاتا۔ اس کا نظریہ خودی قطعاً کوئی نیا نہیں۔ کیونکہ دانایان روزگار کے نزدیک کوئی خیال یا نظریہ نیا نہیں۔

اقبال کے اس نظریے کی بنیاد عارفانِ حق کا کلام ہے اُس نے "پیام مشرق اور ضرب کلیم" نیز "اسرار و رموز" میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اعتراف کیا ہے کہ وہ بالخصوص عارف رومیؒ کے مائدۂ فیضان کا ریزہ چین ہے اگر چہ کم علم رکھنے والے لوگوں پر اس بات کا رعب بیٹھ سکتا ہے جب کہ وہ اپنے کلام میں رومی، عطار، سنائی، گوئٹے، نطشے، ہیگل، برگستان' ٹالسٹائی، کارل مارکس، آئن سٹائن وغیرہ کے علاوہ لینن اور مسولینی وغیرہ کا ذکر بھی فخریہ انداز میں کرتا ہے لیکن اہل حقیقت اس کے اس اقدام سے یہ کما حقہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کی شاعری محض گل و بلبل کی شاعری نہیں رہی تھی بلکہ اُس کا مفکرانہ اعماق اور گہرائی کے لحاظ سے اپنے زمانے کے تمام مسلم مفکروں سے زیادہ پائیدار ہے۔ کیونکہ وہ بتدریج دور جہالت سے گذر کر یقین و اعتماد کی خوش آئند فضاؤں میں گم ہو گیا تھا۔

اگر وہ محض شاعر رہتا یعنی اگر وہ فطری نظاروں کی عکاسی تک محدود رہتا یا عشق و محبت کی واردات کی ترجمانی کی حد تک رہتا تو ظاہر ہے کہ وہ جوش ملیح آبادی سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا یا جیسا کہ اس نے اکبر الٰہ آبادی کا رنگ بھی اپنا کر اس میں انفرادیت پیدا کرنے کی طرف توجہ دی تھی مگر اس کی کوشش میں ناکام رہا تھا اور اگر وہ اکبر کے رنگ ہی میں شعر کہے جاتا تو ظاہر ہے کہ وہ اکبر سے گوئے سبقت نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ وہ بہت جلدی اس راز کو بھانپ گیا تھا کہ تقلید سے انفرادیت کی تخلیق کرنا ایسا ہی ہے جیسے سرسوں کے تیل سے برقی قمقمہ روشن کرنے کی سعی کرنا یا سرسوں کے روغن سے الیکٹرک پیدا کرنے کا خبط رکھنا۔ اقبال اور جوش میں یہ فرق ہے کہ جوش محض اُردو زبان میں شعر کہتا ہے اور اقبال پر چونکہ شروع ہی سے عالم اسلام کا ہیرو بننے کی دھن رہی تھی۔ اس لئے اُس نے زبانِ فارسی کو اپنا لیا اُس کا تو یہ بھی خیال تھا کہ عربی زبان میں بھی شعر کہے۔ لیکن وہ چند نژاد ہونے کے باعث کامیاب نہ ہو سکا۔ اور "عجمی" ہونے ہی کی حد تک شاعری کرتا رہا۔ لیکن اُسے اپنے اندر یہ بے قائدگی برابر محسوس ہوتی رہی۔ چونکہ ہمارا یہ موضوع نہیں ہے ورنہ اس کے کلام کے حوالے سے اس امر کا ثبوت فراہم کرنا چنداں مشکل بات نہیں۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت یا فطری مناظر کی عکاسی کے نقطہ نگاہ سے اقبال کا جوش یا جوش سے اضافہ کرنے والے احسان دانش سے گوئے سبقت لے جانا محال ہے جوش کی شاعری میں کوئی خاص نصب العین نہیں۔ یہی حال احسان اور دیگر شعراء کا ہے مگر اقبال ایک خاص آدرش یا مشن کا داعی ہے۔ اگر اس کا آدرش کوئی نئی بات نہیں تاہم اُس نے اپنے فلسفہ خودی کو اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے کیونکہ خود اُسے اس پر کامل ایمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اظہار بیان انداز سخن اور طریق اظہار میں خلوص ہے کیونکہ خلوص ہی کسی مفکر کو ممتیز کرتا ہے۔

ورنہ شاعری میر انیس نظیر اکبر آبادی، میر و غالب جوش، احسان و دانش وغیرہ بھی اچھی کر لیتے ہیں۔

اقبال کے طریق میں جنت اور دنیا پن ہے لیکن اُس کے تفکر میں قطعاً جدت نہیں کیونکہ جس فکر یا فلسفے اور اس کی شاعری کی بنیاد ہے وہ جدید اور نیا نہیں۔ اور کوئی ایسی بات

بھی نہیں جس کی رو سے اقبال کو ہدف تنقیدی بنایا جائے اگر اس کے اشعار میں فنی نقائص موجود ہیں لیکن اس کے اپنے نکتہ نگار سے ایک فلسفے کے ترجمان یا پیغامبر کو ہم مطمئن نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود کہتا ہے کہ مجھے شاعری کا دعویٰ نہیں۔ اور یہ بات اُس نے اپنے کلام میں بار بار دہرائی ہے لیکن راقم الحروف اقبال کو فکری لحاظ سے ضرور رومی ایسے اصحاب دل کا مقلد سمجھتا ہے اس نکتہ نگاہ سے وہ کوئی نئی راہ یا ڈگر اختیار کرنے میں قطعی ناکام ہے لیکن اس کے مقابلے میں ٹیگور کل انسانیت کا پیغامبر ہے مگر وہ اس لئے مقبولِ خاص و عام نہیں کہ اس نے اپنے افکار عالیہ کو بنگالی اور انگریزی میں پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ زبانیں بولنے والے ہی اُسے سمجھ سکتے ہیں اس کے برعکس اقبال نے اُردو اور فارسی میں اپنا پیغام دیا۔ اور اُس کا روئے سخن ایک خاص قوم سے ہے اگرچہ وہ جغرافیائی حدود کی تخلیق کرنے والے امتیازات کا قائل نہیں لیکن عملاً وہ ایک سخت گیر اور کٹر قسم کا مسلمان ہے اور وہ اپنا مرکز اُس خطہ زمین کو سمجھتا ہے جس کے باشندے عرب ہیں۔ جن کی زبان سوا ان ممالک کے باشندوں کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ جو نسلی اور لسانی طور پر اپنے آپ کو دنیا بھر کی اقوام سے برتر سمجھتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ نسلی اور لسانی تعصب انہیں ورثے میں ملا ہے چونکہ باقی مسلمان بھی حجازی کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ شعوری طور پر بھی اقبال ہی کے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ اقبال نے بانگِ درا کی شاعری کے ابتدائی دور میں محسوس کر لیا تھا کہ اگر وہ "ہندی ہے ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا" کے مطابق اپنی شاعرانہ شخصیت کی بنیاد وطن پرستی پر قائم کرے گا۔ تو وہ جوش اور اسی قبیل کے دیگر شعراء کی صف سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس پر مسلمانانِ عالم کا حکیم مشرق بننے کی دھن سوار تھی چنانچہ اس نے بانگِ درا کے آخری دور میں اپنی راہ و سخن بدل لی۔ چونکہ مسلمان قوم کا انحصار ماضی پرستی پر ہے۔ اس لئے اقبال اُردو اور فارسی کا پہلا ماضی پرست شاعر ہے جس نے ملتِ اسلامیہ کے تاریخی عوامل کا دقیقِ نظر سے مطالعہ کر کے اُسے پرانی یادوں کے ذریعہ بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

بالالفاظ دیگر اقبال ایک مذہبی شاعر ہے اور مذہب انسانیت کے عالم طفولیت کی یادگار ہے جوں جوں انسان کا شعور ترقی کرتا گیا۔ یہ تحریکیں بھی جنہیں مذاہب کا نام دیا جاتا

ہے شعوری ترقی کا پیغام لاتی رہیں چنانچہ ہر دور کا ادتار انہی تحریکات کا ایک فطری محرک ہے اور اقبال ایک طرف ماضی ہی کے احیاء کو مستقبل کا ضامن سمجھتا ہے خواہ یہ ماضی فی الواقع زہرناک ہو کیونکہ کوئی ہوشمند انسان ماضی کا سہارا نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال جس کی شخصیت کے اردگرد عقیدت اور شخصیت پرستانہ جذبہ ارادات کا جو ایک عجیب تار و پود بن دیا جا چکا ہے اور ابھی اس کے اندھے مقلد اس پر اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ مستقبل میں ختم ہو جائے گا اور اس کی شخصیت پر عقیدت کے جو عالی شان ایوان تعمیر کئے جا رہے ہیں دھڑام سے نیچے گر پڑیں گے۔ کیونکہ مستقبل کی تعمیر و تخلیق اقبال کے محدود مذہبی تخلیات پر نہیں رہے گی۔ بلکہ محض انسانی لامحدود اخلاقیت پر ہوگی۔ اور چونکہ مستقبل کا انسان عالم طفولیت کے شعور میں مقید نہ ہوگا اس لئے مذہب کا لاشہ ہمیشہ کے لئے جلا دیا جائے گا اور اس کی راکھ تک باقی نہ بچے گی۔

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدہ عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

(اکبر الٰہ آبادی)

کون اُن جانے خدا سے پیار کی باتیں کرے
عمر بھر ہم نے محبت کی ہے انسانوں کے ساتھ

(ساحر عاصمی)

☆☆☆

قلندری اور اقبال

خدا کو جان لیا میں نے جب خدا نہ رہا
کوئی بھی ہر دو جہاں میں مرے سوا نہ رہا

راقم الحروف نے ابتدائی صفحات میں قلندری کے مسلک پر ذرا وضاحت سے روشنی ڈالی ہے جن کے مطالعہ سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ قلندری کی اصطلاح دور جہالت سے مختص ہے اور قلندر کا ظہور دور جہالت ہی کی صدائے بازگشت ہے مذہب کے لغوی معنی راستہ ہیں۔ اگر مذہب کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو حقیقی شاہراہ حیات کی طرف رہبری کرتا ہوا منزل مقصود پر پہنچانے میں ممد و معاون ہو۔ تو ٹھیک ہے اگر اس کا مقصد اس کے سوا کچھ اور ہے تو یہ سمجھنے والوں کی جبلی جہالت کا نتیجہ ہے چونکہ مذہب راہ زنی ہی کا کام کرتا رہا ہے اس دور میں مذہب قطعی ختم ہو چکا ہے ورنہ دنیا کے تمام مذاہب کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ انسان ایک دوسرے سے دیانتداری خلوص ایمان اور محبت سے پیش آئیں مذہب غصہ حسد کینہ بغض لالچ شہوت وغیرہ جذبات حیوانی کی مخالفت کا مدعی تھا۔

کیونکہ یہ جذبات حیوان کسی پیمانے کے بھی ہوں۔ معاشرہ انسانی کے لئے خطرناک ہیں اگر یہ جذبات مذہبی رنگ اختیار کر لیں۔ تو شریعت کا نام پاتے ہیں۔ انہی جذبات کا دوسرا نام جہاد رکھ دیا جاتا ہے یہی جذبات جب روحانی قالب اختیار کرتے ہیں۔ تو انہیں مختلف قسم کی روحانی اجارہ داریوں کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ ان کا کامل استیصال ہی ایزدیت کا مقصد ہے اور قلندری کی اصطلاح اس شخص پر منطبق ہوتی ہے جس کی شخصیت میں ذرہ بھر بھی تعصب نہ ہو جو لامحدودیت اور لامتناہیت کا مکمل ظہور ہو۔

جب بو علی قلندر نے کہا۔

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک
ترک دنیا ترک عقبیٰ، ترک مولا، ترک ترک

تو وہ اپنی عظیم الشان شخصیت کی ترجمانی کر رہے تھے جس کا مطلب راقم الحروف دور قلندری کے عنوان کے تحت کہیں بتا چکا ہے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ترک ترک کی منزل اولیاء اور عارفانِ کامل سے بلند تر ہے یعنی قلندری ایک خاص منصب جلیلہ ہے شمس تبریزی بھی قلندر تھے جو کہتے ہیں۔

مرد خدا مست بود بے شراب — مرد خدا سیر بود بے کباب
مرد خدا والہ و حیراں بود — مرد خدا را نہ بود خورد خواب
مرد خدا شاہ بود زیر دلق — مرد خدا گنج بود در خراب
مرد خدا نیست ز نا روز آب — مرد خدا نیست زنا روز آب
مرد خدا بحر بود بے کراں — مرد خدا بردود بے سحاب
مرد خدا دارد صد ماہ و چرخ — مرد خدا دار و صد آفتاب
مرد خدا عالم ازحق بود — مرد خدا نیست فقیہ از کتاب
مرد خدا زاں کفر و دیں — مرد خدا اچہ خطا چہ ثواب
مرد خدا گشت سوار از عدم — مرد خدا آمد عالی رکاب
مرد خدا ست ہماں شمس دیں — مرد خدا را تو بجوی ابیات

غوث علی قلندر کا ارشاد گرامی تذکرہ غوثیہ کے حوالے سے پہلے ہی لکھا جا چکا ہے حقیقت میں فقیری ہم قلندری ہے اور قلندری رسوم و رواج عقاید وغیرہ سے وراء الورا ہے ویسے بھی موحد کا مقام بقول غالب یہ ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

عبودیت کی انتہا ربوبیت کی ابتدا اور ربوبیت کی انتہا قلندریت ہے بقول ابو سعید ابو الخیر۔

تا مدرسہ و خانقاہ ویراں شود
ایں کار قلندری آساں نہ شود

یہ قلندری راز سربستہ ہے جس سے عام حکماء علماء اور فضلا باخبر نہیں۔ اقبال نے اس راز

کو علمی طور پر معلوم کر لیا تھا لیکن محض سر قلندری کا علم حاصل کر لینا ہی کافی نہیں۔ کیونکہ علم جب تک عمل کی منزلوں میں داخل نہ ہو خود روح کی تشنگی کا باعث ہے جس طرح علم کے کئی مراحل ہیں۔ اسی طرح علم کو عمل بنا لینے کے بھی لا انتہا مقامات ہیں دراصل علم ہی عمل ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے نظریئے قائم کئے انہوں نے سب سے پہلے اپنے تجربے یا عمل ہی سے ان کی دریافت کی تھی۔ اب اگر دوسروں نے ان کے نظریات پر خلوص مندی سے عمل درآمد کیا۔ تو گویا یہ ان نظریات کی تصدیق تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے نظریات پر اس حد تک عمل کیا کہ عمل کی نئی منازل دریافت کر لیں۔ اس طرح علم و عمل لامحدودیت کی قلمروئے عظیم میں داخل ہوتے تھے۔ کیونکہ جس طرح علم لامحدود ہے اسی طرح عمل بھی لامحدود ہے۔

اگر تنقید اور نقالی علم کا جزو خاص بن کر رہ جائے تو تجربہ و عمل کی راہیں مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور نئے نظریات بھی تخلیق پذیر نہیں ہو سکتے۔ یعنی تہذیب و تمدن تدریجی وارتقائی منازل سے محروم ہو کر رہ جائیں۔ بالکل ایسے ہی جس طرح کسی نے سرسوں سے روغن دریافت کیا تھا جس سے چراغ روشن کئے جاتے تھے اس نے اپنے وقت میں ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا کیونکہ اس سے پہلے مٹی کا تیل دریافت نہیں ہوا تھا اور جس نے آبشاروں سے الیکٹرک کی دریافت کی تھی۔ اس نے کتنا عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا مگر الیکٹرک کی ایجاد و دریافت ہی پر علم و عمل اختیار پذیر نہیں ہوئے کیونکہ اب اٹامک انرجی دریافت ہو چکی ہے۔

اگر اس خیال سے کہ سرسوں کا تیل ماضی کے تبرکات میں سے ہے اسے مٹی کے تیل، الیکٹرک اور اٹامک انرجی پر ترجیح دینا چاہیئے۔ برقی قمقموں کی بجائے دیئے، چراغ یا شمعیں روشن رکھنا" ایک مقدس فرض ہے تو کیا یہ مضحکہ خیز اور احمقانہ بات نہیں؟

ہر کتاب خواہ وہ ارضی ہو یا سماوی وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں ہی کی ترجمان ہے ظاہر ہے کہ ضرورتیں خواہ وہ بنیادی حیثیت رکھتی ہوں اور تقاضے خواہ وہ اٹل ہوں تنوع کے اعتبار سے تغیر پذیر ہیں کسی شاعر کا کلام بھی خواہ وہ کتنی ہی مفکرانہ حیثیت رکھتا ہو کچھ وقت گذرنے پر قدرتاً متروک ہو جاتا ہے کیونکہ ہمیشہ ارضی زمان و مکان کے تقاضے انقلاب

کے قانون ابدی کی زد میں ہیں۔

راقم الحروف نے قلندر کے عظیم المرتبت منصب جلیلہ کی توضیح کردی ہے اب اس کی روشنی میں دیکھئے۔ کہ اقبال کا قلندر زمانہ تفاخر کہاں تک بجا ہے؟ جس شخص نے اُسے سب سے پہلے انسان کی عظمت و تقدیس کا علم دیا۔ وہ سوامی رام تیرتھ ہیں جو پرم ہنس کے خطاب سے سرفراز ہیں۔ پرم ہنس سے مراد یہ ہے کہ سوامی صاحب اپنے وقت کے تمام یوگیوں' ودیارتھیوں' ویسوں' سنتوں' سادھوؤں' گیانیوں' فقیروں اور عارفوں سے بہت اوپر اور پرے تھے۔ کیونکہ سوامی صاحب فی الواقع ترک دنیا' ترک عقبےٰ اور ترک مولا کی سرحدوں کو پار کرنے کے بعد ترک کی منزل مقیم و ممکن تھے۔ جہاں دیر و حرم کلیسا' مذاہب' پنتھ اور قومی و وطنی امتیازیات کالعدم ہو جاتے ہیں۔ جنہوں جسم' جان اور جہان ہیں نہ سم و جسم و رسم۔

اقبال نے علمی طور پر سوامی رام تیرتھ سے استفادہ و استفاضہ کیا تھا چنانچہ اُس نے سوامی صاحب کی وفات پر جو نظم لکھی وہ نہ صرف اس کے عقیدت مندانہ جذبات کی ترجمان ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ وہ مسئلہ فنا و بقا اور لا الہ الا اللہ کے اسرار پنہاں سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ بایں ہمہ راقم الحروف اقبال کو قلندر نہیں سمجھتا۔ کیونکہ قلندر فی البطن تمام قسم کے رسمی تکلفات سے مستغنی ہوتا ہے اور زمان و مکاں سے وراء الورا۔ اگرچہ اقبال بھی علمی اور فکری طور پر اپنے آپ کو زمان و مکاں سے آزاد سمجھتا ہے مگر عملاً وہ زمان و مکان کی حدود و قیود میں ہے جبکہ وہ ارضی زمان و مکاں کے اندر ایک روایتی مرکز کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرکے سر افتخار بلند کرتا ہے۔ حالانکہ قلندر عبودیت و ربوبیت کے مخمصوں سے پاک ہوتا ہے۔

اوتار اور پیغمبر بھی قلندر قدیم ہیں۔ جنہیں لکیر کا فقیر نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنے بے مثال روحانی تجربہ و عمل سے وقتاً فوقتاً نئی راہ عمل پیدا کرنا چاہئے کیونکہ وہ ماضی کے کسی مذہب یا پنتھ کے پیروکار نہیں ہوتے نہ ہی رسوم و رواج کے پابند ہوتے ہیں مگر لوگ ہمیشہ انہیں اپنے مفروضہ رسمی اور روایاتی مذاہب کے خود ساختہ پیمانوں پر ناپنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب

انہیں اپنے محدود معیار پر پورا نہیں پاتے۔ تو اُن کے مخالف ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ تو ان جہالت میں ڈوبے ہوؤں ہی کو نورِ عرفان سے منور کرنے کے لئے مامور ہوتے ہیں جن کے رویوں پر دنیا مذاہب بناتی چلی آتی ہے وہ مذاہب کے مدعی نہیں ہوتے۔ کتابیں ان کے تجربات ہی کا علمی خزانہ ہیں لیکن کوئی کتاب بھی اقتدار زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ جسے کہا جائے کہ یہ واقعی انسان کامل کے تجربے کی ترجمان ہے۔ اس کی من وعن تصنیف ہے اب ان کتابوں کو پرکھنے کے لئے عمل ہی واحد کسوٹی ہے چنانچہ قلندر کا وجود ایک کسوٹی ہے جو خود کتابوں کی کتاب اور سندوں کی سند ہوتا ہے کیونکہ کتابیں جہلا کے لئے ہوتی ہیں ورنہ جو اہل علم و عمل ہیں وہ تو آپ مجسم کتاب ہیں اہل نظر جانتے ہیں وہ اقبال عظمت قلندری کا مالک نہیں تھا۔ اس کا علم اکتسابی ہے وہبی نہیں۔ اس نے اس اکتسابی علم سے مسلمانوں کے لئے جو راہِ عمل متعین کی۔ وہ تقلید و نقالی کے خار مغیلاں سے اٹی ہوئی ہے انہیں وہ جس راہِ عمل پر لے جانا چاہتا ہے اُسے خود عرب نہ صرف کب سے چھوڑ چکے ہیں بلکہ نہایت مختصر عرصہ تک تجربہ کرنے کے بعد نا قابلِ عمل قرار دے چکے ہیں۔ اقبال جس سرزمین کو مقدس مرکز بنا رہا ہے وہاں سالہا سال سے اب بھی شخصی حکومت قائم ہے کیا وہ حکومت اُس کے تصورات کے تفسیر ہے؟ دراصل اقبال مسلمان قوم کے مزاج سے واقف تھا ۔ کہ یہ ایک جذباتی قوم ہے چونکہ وہ موقع پرست تھا ہر غیر معمولی قسم کا ذہین انسان ہر شعبہ حیات میں اپنی ذہانتوں سے اپنے لئے میدان ہموار کرتا ہے اور اقبال بھی اس بات سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ اس نے اس قوم کے لئے جو شاعری کی۔ وہ اس کے مزاج کے مطابق تھی۔ اُس نے اسے جو پیغام دیا وہ اس قوم کی طبیعت کے منافی نہ تھا لیکن خود اقبال بھی اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ کہ اب نوعِ انسان کے تمام امراض کا شافی علاج ماضی پرستی میں مضمر نہیں۔ بلکہ قلندری مسلک میں ہے۔ جو انسان کو ریاکاری اور منافقت کی زندگی سے نجات دے کر حقیقت میں آفاقی بناتا ہے ورنہ مذہبی لوگوں کی زندگی تو منافقت اور ریاکاری ہی کی ترجمان ہے اس کی وجہ عرفانِ ذات کے علم سے دوری اور بے خبری ہے کیونکہ یہ علم ہی بتاتا ہے کہ کل انسانیت ایک آفاقی کنبہ ہے جو کسی رسم و جسم ورسم اور کسی نوح

کی محدودیت سے ماورا ہے۔

اب اقبال ہی کی زبانی سنیے کہ قلندر کیا ہے۔

وہ بوعلی شاہ قلندر ہی کی مثنوی کے ایک شعر کا مفہوم بیان کرتا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

بوعلی کہتا ہے۔

پشہ پازن تخت کیکاؤس را
سر بدہ ازکف مدہ ناموس را

قلندر کے نزدیک ہر وہ خواہش، آرزو، تمنا، جذبہ، اُمنگ، ولولہ، رجحان، ارادہ، خیال اور تصور غیر ہے جو انسان کی ذات حقیقی سے دور کرتا ہے کیونکہ یہ دوری ماسوا ہے اقبال چونکہ علمی طور پر عرفان ذات سے باخبر تھا۔ وہ قلندر کے فرمودے پڑھ کر جب اپنا محاسبہ کرتا ہے تو نادم ہو جاتا ہے اور اپنی ندامت کو اوروں پر محمول کر کے بے اختیار یہ پیغام دیتا ہے کہ غیر کے سامنے سر تسلیم خم کرنا عظمت و تقدیس انسانی کے منافی ہے۔

کہتا ہے:۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

قلندر نے جو ذات حقیقی سے مل کر مجسم حق ہوتے ہیں۔ انہیں خوف کس کا؟

یہ ہے خلاصہ علم قلندری کہ حیات
خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

قلندر کی زندگی تو حقیقی زندگی ہے اور حقیقی زندگی ہی ایزدی زندگی ہے یہ زندگی بے موت ہے بلکہ موت کی تسخیر کا دوسرا نام حقیقی زندگی ہے علم قلندری کا خلاصہ خدنگ جستہ کیونکر ٹھہرا؟ جبکہ قلندر ذات حق میں مدغم ہے اُس کے جسم کا ذرہ ذرہ حق ہے ترک و ترک کے بعد زندگی کو خدنگ جستہ کہنا اور پھر کماں سے بھی دور نہ کہنا۔ عجیب بے معنی سی بات

ہے۔ مگر چونکہ اقبال پرتوں پر اس کی شخصیت کا رعب بیٹھ چکا ہے اس لئے انہیں کبھی یہ سوچنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی کہ اقبال نے روحانی سفر میں ایک ناکام مسافر رہنے کے بعد اپنے آپ کو قلندر کے عظیم الشان نام سے موسوم کرنے میں اپنی شکست خوردگی کا احساس مٹانے کی کوشش کی ہے کیونکہ راقم الحروف پہلے ہی بتا چکا ہے کہ قلندری ایک منصب جلیلہ کی روحانی اصطلاح ہے بالالفاظ دیگر قلندر اس ہستی کا نام ہے جو بندے کے روپ میں خدا ہے یعنی وہ روحانی مقامات و منازل طے کرتے ہوئے مقام لاہوت میں پہنچتا ہے جو روحانیت کی آخری منزل کا آخری مقام ہے تو پھر واپس لوٹ آتا ہے جو بیہوش بے ہوشی کی ایزدی کیفیت سے سرفراز ہے مگر افسوس اقبال کے ساتھ اور بہت سے شاعروں نے بھی اپنے آپ کو قلندر کہنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ اقبال کے بعد مقلد اقبال پرستی میں مبتلا ہو کر اپنی انفرادیت بھی کھو بیٹھے اور اقبال بھی نہ بن سکے قلندر نہ ہونے کے باوجود بزعم خویش قلندر بننا سوءِ ادب ہے

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

وہ کیا اسرار کتاب ہیں جو قلندر (اقلاب) نے کہہ دیا ہے بس اس نوع کے کہ

آتجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

یہ تو تاریخ کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ کتنی ہی قومیں اور ملتیں اپنے ابتدائی دور میں جہاں گیر، جہاندار اور جہان بان ہوئیں مگر آخری دور میں جب قاعدے کے مطابق زوال و نامرادی کی شکار ہونے لگیں۔ تو عیش و عشرت میں مستغرق پائی گئیں۔

ہے خانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

یا اس غزل کے دیگر اشعار میں وہ کیا اسرار کتاب ہیں جو "قلندر صاحب" نے کہہ ڈالے ہیں جو پہلے کسی کو معلوم نہ تھے؟

وہ مردِ مسلمان سے کہتا ہے؟

تری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

گویا اقبال قرونِ اُولیٰ کے سب مسلمانوں کو قلندر سمجھتا ہے اور اُن کی خصوصیت یہ بیان کرتا ہے کہ وہ حریف کے مقابلے میں سرتاپا جلال تھے ان کی نگاہوں میں خشمگیں بجلیاں تھیں۔ جن کے اثر سے حریفوں کے دل لرزتے تھے اور اس دور کے مسلمان سے اُسے گلہ ہے کہ اُس کا وہ "جذبِ قلندرانہ" کھویا گیا ہے۔ اگر قلندر صاحبِ ایمان شخص کو کہتے ہیں تو یہ اقبال کی قلندر کے بارے میں غلط تعبیر ہے کیونکہ قلندر نہ صرف صاحبِ ایمان ہوتا ہے بلکہ مجسم ایمان اور سرچشمہ ایمان ہوتا ہے جبکہ وہ مجسم خدا ہے۔ دراصل اقبال کا "مردِ مومن" بھی کوئی عام قسم کا "صاحبِ ایمان شخص" ہے۔ جس کی تصورِ اعلیٰ تصویر اُس نے تاریخ سے مستعار لی ہے اور اس میں جو رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں وہ بھی تاریخ ہی سے اخذ کی گئی ہیں جو بادشاہت اور شہنشاہیت کی ایک اُکتا دینے والی داستانِ وحشت ناک ہے۔

اقبال کو ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ کہ اُس کا تعلق بادشاہِ افغانستان کے علاوہ دیگر سلاطین وقت کے ساتھ بھی ہے درحقیقت وہ فطرتاً شاہ پسند تھا کیونکہ عملاً اس کی فطرت سرمایہ پرستانہ تھی مذاہب کی ایجاد بھی سرمایہ داری اور جاگیرداری نیز قبائلی اجارہ داریوں ہی کی شخصی سیاست کا نتیجہ ہے ایک جگہ وہ اپنی سرمایہ پرستانہ ذہنیت کی وضاحت بھی کرتا ہے کیونکہ وہ اُسی ذہنیت کو اکثر قلندری جذبہ تفاخر سے موسوم کرتا ہے۔

یوں ہاتھ نہیں آتا یہ گوہرِ یکدانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ
یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ

قلندر اپنے ماحول کی صدائے بازگشت ہوتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ تکلفاتوں

سنجروں اور طغرلوں کا دستگیر یا پشت پناہ یا وقت کے ظاہری حاکم یا شہنشاہ کی حاکمیت یا شاہنشاہیت کی باطنی تصویر کے علاوہ اقتدار اعلیٰ کا بھی مظہر کامل ہو لیکن اقبال جسے طغرلوں اور سنجروں سے اندھی عقیدت ہے اپنی شخصی ملوکیت کو قلندر کا معیار قرار دیتا ہے حالانکہ ملوکیت بادشاہت اور ملوکانہ خلافت میں یک رنگی و آزادی کا تصور تک کہاں ہے؟ دراصل اقبال ایک شاعر تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے ذاتی جدوجہد سے شاعری کا انداز بدل ڈالا۔ اور شاعری کے پردے میں خواہش اقتدار کی تکمیل میں منہمک ہو گیا۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتا۔ تو اس کے اپنے تخیلات میں تضاد واقع نہ ہوتا۔ وہ کبھی مرد قلندر کو ملوکیت کا روپ دیتا ہے اور کبھی اُسے تاج و تخت سے ماورا سمجھتا ہے۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

جب ملوکیت کا دور ہو۔ تو مرد قلندر تو لوگوں کی حکومتیں عطا کرتا ہے یعنی کسی کو تاج و تخت عطا کرتا ہے اور کسی سے واپس لے لیتا ہے اگر اقبال نے قلندر کے منصب جلیلہ کو پوری طرح سمجھ لیا ہوتا۔ تو اس کے کلام میں تخالف و تضاد نہ ہوتا حالانکہ اُس نے اپنی مثنوی میں قلندر کی عظمت منکشف کر دی ہے۔

جبکہ وہ سفر نامہ ابن بطوطہ سے ایک واقعہ مستعار لیکر منظوم کرتا ہے۔

با تو می گویم حدیث بو علی — در سواد ہند نام او جلی
آں نوا پیرائے گلزار کہن — گفت بابا از گل رعنا سخن
خطہ ایں جنت آتش نژاد — از ہوائے دامنش مینو سواد
کوچک ابدالش سوئے بازار رفت — از شراب بو علی سرشار رفت
عامل آن شہر ی آمد سوار — ہمرکاب او غلام و چوبدار
پیشرو زد بانگ اے نا ہوشمند — بر جلوداران عامل رہ مبند
چوبدار از جام استکبار مست — بر سر درویش چوب خود شکست
از رہ عامل فقیر آزردہ رفت — دلگران و ناخوش و افسردہ رفت

در حضور بوعلی فریاد کرد اشک از زندانِ چشم آزاد کرد
صورت برقے کہ بر کہسار ریخت شیخ سیلِ آتش از گفتار ریخت
از رگِ جاں آتشِ دیگر کشود بادبیر خویش ارشادے نمود
خامہ را برگیر و فرمانے نویس از فقیرے سوئے سلطانے نویس
بندہ ام را عاملت بر سر زدہ است بر متاعِ جانِ خود اخگر زدہ است
باز گیر ایں بد گوہر ے ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے
نامہ آں بندہ حق دست گاہ لرزہ ہا انداخت در اندامِ شاہ
پیکرش سرمایہ آلام گشت زرد مثلِ آفتاب شام گشت
بہر عامل حلقہ زنجیر جست از قلندر عفوِ ایں تقصیر جست
خسرو شیریں زبان رنگیں بیاں نغمہ ہایش از ضمیر کن فکاں
فطرتش روشن مثالِ آفتاب گشت از بہر سفارت انتخاب
چنگ را پیش قلندر چوں نواخت از نوائے شیشہ جانش گداخت
شوکتے کو پختہ چوں کہسار بود قیمتِ یک نغمہ گفتار بود

نیشتر بر قلبِ درویشاں مزن
خویش را در آتشِ سوزاں مزن

سفرنامہ ابنِ بطوطہ گواہ ہے کہ وہ محمد شاہ تغلق کا عہدِ حکومت تھا جس کے دربار میں امیر خسرو موجود تھے کیونکہ انہیں اپنے شیخ (خواجہ نظام الدین صاحب) کی طرف سے اجازت حاصل تھی کہ وہ سلطانِ وقت کے اُمراء و اعیانِ سلطنت میں شمار ہوں۔ اور اُس زمانے میں صوبہ کرنال کا گورنر مرکز (دہلی) کی طرف سے مقرر ہوتا تھا جو قلندر کا زمانہ تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فقراء کی بہت قدر و قیمت تھی ان کی کرامات نے لوگوں کے دلوں کو مسخر رکھا تھا ورنہ اگر ہمارے زمانے میں کوئی "قلندر" یہ طریقہ اختیار کرے تو اُسے فوراً پاگل خانے پہنچا دیا جائے۔ کیونکہ قلندر زمانے کے تیوروں کو پہچانتا ہے اگر چہ نظامِ کائنات اسی کے دستِ تصرف میں ہوتا ہے اور حکومتوں کا ردّ و بدل بھی۔ لیکن وہ شاذ و نادر ہی اپنی تجلی

قوتوں کا اس طرح مظاہرہ کرتا ہے۔

بہر حال اقبال نے اس منظوم واقعے سے ثابت کر دیا۔ کہ قلندری کی عظمت کیا ہے؟ اور اس کا مقام کتنا حیرت ناک ہے!

بردر میکدہ رندان قلندر باشند
کہ ستانند و ہند افسر شاہنشاہی

سفرنامے میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا گیا ہے کیونکہ خود سیاح (ابن بطوطہ) اُس وقت دہلی میں بادشاہ کا مہمان خاص تھا جس کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا تھا وہ لکھتا ہے جب بو علی کا قاصد رقعہ (فرمان) لے کر سلطان کے پاس پہنچا تو وہ اُس وقت پاؤں سے جُوتے اُتار کر بے تکلفانہ تخت حکومت پر بیٹھا تھا۔ اس نے لرزیدہ ہاتھوں سے رقعہ پڑھا اور پا برہنہ قاصد کی پیشوائی کے لئے سارا فاصلہ طے کیا۔ انتہائی احترام سے اس کا استقبال کیا اور قلندر کے فرمان کے بموجب عامل و گورنر کو پا بجولا اپنے حضور طلب کیا۔ اور قلندر سے عفو خواہ ہوا۔ سلطان کی طرف سے قاصد کے فرائض امیر خسروی نے سرانجام دیئے تھے نظم کے آخر میں اقبال یہ کہتا ہے۔

نیشتر بر قلب درویشاں مزن
خویش را در آتش سوزاں مزن

یوں تو دل آزاری ہے ہی گناہ عظیم۔ مگر درویشوں کا دل دُکھانا اپنے آپ کو نار جہنم میں بھسم کرنا ہے طریقت میں تو چیونٹی کا دل دکھانا بھی عظیم گناہ ہے چہ جائیکہ انسان کی دل آزاری روا ہو۔ بقول حافظ

وفا کنیم ، ملامت کشیم و خوش باشیم کہ
در طریقت ما کافری ست رنجیدن

اور کہتے ہیں:

خاکساران جہان را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشند

جب دور قلندری شروع ہوا۔ تو اس کے ساتھ ہی جعلی اور نقلی قلندر بھی پیدا ہونے لگے جو اس زمانے کے مطابق ظاہری وضع قطع سے تو قلندر معلوم ہوتے تھے لیکن انہیں معرفت حاصل تھی نہ وہ مقام قلندری ہی پر فائز تھے چونکہ عام مذہبی طبقہ قلندر کے عظیم الشان منصب اور اس کی بے نظیر حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ اس لئے وہ ان ہی قلندروں کے حلقہ بگوش عقیدت بغرض جلب منفعت کرتے تھے۔ اسی لئے قلندر (حافظ شیراز) کو کہنا پڑا۔

ہزار نکتہ باریک ترز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

حافظ کے دور میں صوفیان ریاکار اور قلندران ہرزہ کار معاشرے پر برساتی کیڑوں کی طرح چھائے ہوئے تھے جو شریعت اور طریقت کے نام پر عوام الناس کی آنکھوں میں غبار فریب جھونک دے رہے تھے ایک طرف عیاشی کا بازار گرم تھا دوسری طرف ریاکار صوفی خرقہ سالوس زیب تن کئے عوام سے نذر و نیاز بطور خراج وصول کرتے تھے۔ چنانچہ حافظ نے بروقت لوگوں کو اپنے خاص دلفریب انداز سے متنبہ کیا۔ اس صورت حال کا جائزہ لے کر اپنے وقت کے معاشرے کا محاسبہ کیا۔ اور بھرپور طنز کی۔

حافظ مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآن بسا

مذہب ایسی چیز ہے جو انسان کی ماضی پرستانہ کمزوریوں میں سے سب سے عجیب اور عظیم کمزوری ہے۔ جس کے پردے میں انسان نے انسان کے ساتھ وہ سفاکانہ حرکات کی ہیں جن کی تفصیل بجائے خود ایک لرزہ خیز اور عبرت ناک داستان ہے اگرچہ اقبال نے بھی علماء سوء اور صوفیان مکار کی قلعی کھولنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر اس نے بھی قوم کا مذہب کے نام سے استحصال کیا۔ وہ قبر پرست تھا یہ قبر پرستی مختلف ذہنی اور نفسیاتی کمزوریوں اور حیلہ جوئیوں کے سبب وجہ جواز پیدا کر لیتی ہے کبھی عقیدت کے رنگ میں اور کبھی جہالت کے انداز میں اقبال ایک مرتبہ دہلی گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ہم مشرب بھی تھے اس نے غالب کی قبر پر حاضری دی اور قبر کا بوسہ لیا۔ اس کے علاوہ اس کا متعدد

مزارات پر حاضری دینا بھی ثابت ہے کیونکہ خود اُس نے اپنے کلام میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جن کے نام سے وہ مزار موسوم ہیں اسی بات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ چشم بصیرت سے بھی محروم تھا۔

قلندر کبھی قبر پرست نہیں ہوتا اگر وہ بھی قبر پرست ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے عرفان ذات نہیں اس لئے وہ قلندر نہیں بلکہ ایک بے خبر یا جاہل شخص ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثر طالبانِ حق اپنے ابتدائی دور میں مزاروں پر جا جا کر حاضری دیتے رہے۔ کیونکہ اس وقت تک انہیں رہبر کامل نصیب نہیں تھا۔ اس لئے وہ "مزاروں" سے استمداد کرتے رہے مگر بعد میں جب ان پر حقیقت واضح ہوگئی۔ تو انہیں ہمیشہ اپنے اس جاہلانہ اقدام سے ندامت ہوئی "قلندر کی پہچان" کے ضمن میں اقبال کہتا ہے۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

بالا الفاظ دیگر قلندر زمانہ ساز نہیں ہوتا بلکہ صاحب زمانہ ہوتا ہے وہ اپنے کردار سے نیا زمانہ بناتا ہے اقبال علمی صداقتوں سے باخبر تو ہے مگر عملی تصدیق کی طرف سے بالکل کورا بھی دکھائی دیتا ہے۔

افکار جوانوں کے جلی ہوں کہ خفی ہوں
پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے

قلندر کی نظر لامحدود ہوتی ہے کیونکہ اُس کا یزدانی لامتناہیت سے تعلق ہوتا ہے وہ محیط بے کراں سے ہمکنار ہو کر محیط بے کراں ہو جاتا ہے قطرہ سمندر سے مل کر سمندر ہو جائے تو قطرہ نہیں کہلاتا اس لئے قلندر کی نظر بھی لامتناہیت کی نظر ہوتی ہے اُس کا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اندھیرے مٹ جائیں۔ اور روشنی کی چادر بسیط بچھ جائے یہاں اقبال جو اپنے آپ کو قلندر سمجھتا ہے دعویٰ کہ وہ موجودہ دور کے جوانوں کے افکار یا رجحانات سے باخبر ہے اسی لئے انہیں شہباز و شاہین بنانے کی تعلیم دے رہا ہے یہ "باخبری" گویا قلندرانہ صفت ہے۔

ازل سے فطرت احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

یہاں وہ اُن لوگوں کو بھی قلندر سمجھ رہا ہے جو تاریخ اسلام میں سلاطین اور بادشاہ کہلاتے ہیں حالانکہ یہ اس کی غلط اندیشی ہے کیونکہ آپ اسے معلوم نہیں کہ قلندری اصطلاح اور مسلک قلندری کب شروع ہوا؟؟ اگر اُسے علم ہوتا کہ دورِ شریعت کی ریاکارانہ چالبازیوں کا ردِ عمل دورِ قلندری کا آغاز ہے یا دورِ شریعت کے زوال کی انتہا دورِ قلندری کی ابتدا ہے تو وہ اصطلاح قلندر کو سوچ سمجھ کر استعمال کرتا۔ دراصل اقبال دورِ ماضی کے افرادِ قوم کو جلالی پیکر میں پیش کر کے بزعم خویش ایک کارنامہ عظیم سرانجام دے رہا ہے اور لفظ قلندر کا استعمال اپنے کلام میں جا بے جا استعمال کر کے "پدرم سلطان بود" کی تعبیر پیش کر رہا ہے اس کے علاوہ وہ آنے کو "مہدی برحق" بھی سمجھتا ہے اور براہِ راست اپنے مہدی ہونے کا دعویدار ہونے کی بجائے INDIRECTLY کہتا ہے" کیونکہ ڈرتا ہے"۔

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار

حالانکہ مسلمان قوم میں اس سے قبل بھی خود فریبی میں مبتلا رہ کر نہ جانے کتنے ہی لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے؟ لیکن اقبال نے اکثر اپنے آپ کو قلندر کہنے تک اکتفا کیا۔ اور بالواسطہ طور پر مہدی بھی کہا ہے وہ کہتا ہے میری نگاہ نے افکار میں زلزلہ برپا کر دیا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اور کس نے ایسا کیا ہے؟

ترک دنیا کوئی بازیچہ اطفال نہیں۔ ترک دنیا لالچ، حسد، کینہ، بغض وعناد اور شہوانیات سے دستبردار ہونا ہے عملاً دستبردار ہوتا ہے۔

نے قماشِ نقرہ و فرزند و زن

کیونکہ جو شخص حاسد، لالچی، کینہ پرور اور شہوت پرست ہے وہ خدا سے غافل ہے کیونکہ خدا کا طالب ان مذمومات سے پاک ہوتا ہے تو تارک الدنیا ہوتا کوئی بچوں کا کھیل نہیں یہ اور بات ہے کہ ترک دنیا سے آگے بھی کئی منزلیں ہیں ترک دنیا کی منزل اچھی

سوسائٹی، اچھی صحبت، تطہیر خیالات، تخلیہ اور مجاہدہ کے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی۔ یہ منزل لگاتار مجادلہ بالنفس سے حاصل ہوتی ہے تارک الدنیا کو اس منزل میں کرامات اور معجزات حاصل ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ ظاہریت کو نظر انداز کر کے اپنے باطن میں ڈوب جاتا ہے اور باطن کی مخفی قوتوں کا مالک بن جاتا ہے لیکن عربی زبان میں ایسے شخص کو راہب کہتے ہیں اور سنسکرت میں یوگی۔ مگر حقیقی مقصد اس سے بھی بہت آگے ہے اقبال جس نے پہلی منزل کا بھی تجربہ نہیں کیا اپنی قوم کو خبردار کیا ہے کہ رہبانیت مسلمانی نہیں حالانکہ کسی کو خبردار کرنے کا مدعی وہ ہوتا ہے جو خود تجربہ کی زندگی بسر کرتا رہا ہو کیونکہ تجربہ ہی سب سے بڑی سند ہے یہ اور بات ہے کہ اقبال نے مراقبے کے ذریعہ یکسوئی اختیار کر لی تھی یکسوئی اسے شاعری میں مفید ثابت ہوئی مطالعے کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک مطالعہ سطحی ہوتا ہے جس کے عادی عام طور پر علماء و فضلا عام قسم کے ادیب اور شاعر وغیرہ ہوتے ہیں ایک مطالعہ وہ ہے جس کا مقصد اپنے قلب و ذہن کو مطمئن کرنا ہے اور یہ مطالعہ تحقیقی ہے اقبال کا مطالعہ بے مقصد نہ تھا بلکہ اس نے اپنے قائم کردہ تصور یا نظریے کی لائنوں پر عمیق مطالعہ جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے اس کی فکر و نظر میں استحکام پیدا ہوتا گیا۔ دنیا میں کوئی خیالی کمتہ نگاہ اور نظریہ نیا نہیں۔ ہر نئے پن کی تہ اَن گنت بار دہرائے ہوئے حقائق پوشیدہ ہیں۔ کائناتِ انسانی علت و معلول کے سلسلہ لامتناہی کے ساتھ وابستہ ہے درحقیقت فردِ کل کائناتِ انسانی کا خلاصہ ہے اس لئے ذہنوں کے ساتھ ذہین دلوں کے ساتھ دل نگاہوں کے ساتھ نگاہ کچھ اس طرح باہمی طور پر منسلک و مربوط ہیں کہ سب شعوری طور پر اس حقیقت ابدی سے باخبر نہیں۔ حتیٰ کہ کوئی الہامی کتاب بھی نئی نہیں نہ کوئی اوتار یا رسول کوئی نئی بات کہتا ہے چنانچہ راقم الحروف نے تلاشِ حق میں جب عارفانِ حق کی باتیں پڑھیں۔ جو مختلف مذہبوں' قوموں اور ملکوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مختلف زبانوں اور بولیوں کا مالک بن جاتا ہے لیکن عربی زبان میں ایسے شخص کو راہب کہتے ہیں اور سنسکرت میں یوگی۔ مگر حقیقی مقصد اس سے بھی بہت آگے ہے۔

حقائق ابدی خواہ کسی زمانے میں کسی نے بھی بیان کئے وہ سدا نئے ہیں البتہ حقیقتوں تک رسائی حاصل کرنے کے طریقوں میں ظاہری و صوری اختلافات ہو سکتے ہیں مگر اہل نظر

ان اختلافات کو بے حقیقت سمجھتے ہیں اور عام لوگ ان کو موضوع بحث بنا کر آپس میں مائل تکرار دکھائی دیتے ہیں جو حقائق حیات سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے یوں تو اقبال ٹھیک کہتا ہے کہ رہبانیت ٹھیک نہیں۔ مگر اُسے اس بات کا غالباً علم نہیں۔ کہ ترک دنیا مقصد حقیقی حاصل کرنے میں لازمی ہے کیونکہ ترک دنیا کے بغیر ولی ہونا بھی تو ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ اُس کے افکار کی بنیاد کتاب ہے اس لئے وہ کتاب میں جو کچھ بھی موجود ہے اُس کے ظاہری معانی کے مطابقت مسلمانوں کو دینا اپنا فرض منصبی سمجھا ہے اور پیغمبروں کی مصلحت شناسیوں سے بے خبر ہے کہ انہوں نے فلاں بات اور کس حالت کے مطابق کہی۔ مگر وہ کہتا ہے۔

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

فقر کی تو متعدد منازل ہیں رہبانیت فقر کی ابتدائی منزلوں میں سے ایک ہے لیکن اس کے بغیر فقرانہ کا حصول بھی تو ممکن نہیں۔

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

حافظ نے جو تصوف کی شاعری کا امام ہے اپنے کلام میں کہیں رہبانیت اور راہبی کو ہدف تنقید نہیں بنایا کیونکہ وہ عملی طور پر ایک سالک مجذوب تھا جس نے فقر کی تمام منازل طے کی تھیں۔ اُس نے اپنے کلام میں زہاد' متصوفیوں' ریاکار واعظوں' مکار مشائخ نیز طبقہ عوام کی فقیری اور مذہب کے نام پر ایکسپلائٹ کرنے والوں کو شد و مد سے نشانہ تضحیک و تمسخر اور ہدف تنقید و احتساب بنایا ہے مگر چونکہ وہ واقف راہ ہے اور فقر کے پیچیدہ راستوں سے باخبر اس لئے اُس نے کہیں یہ نہیں کہا۔ کہ ترک دنیا بُری شے ہے اقبال کی نظر میں غالباً وہ لوگ رہبان ہیں۔ جو حقیقت میں راہب نہیں تھے۔ مگر ظاہری طور پر راہبوں کا سا پہناوا اور رنگ ڈھنگ اختیار کیے ہوئے تھے اور لوگوں کو مذہب کے نام پر بے دریغ بے وقوف بناتے تھے جن کی سفاکیوں کے افسانے منظر عام پر آچکے ہیں کیونکہ مارٹن لوتھر کی تحریک انہیں کے خلاف ردعمل کی حیثیت رکھتی ہے جس کا آغاز انگلینڈ میں ہوا۔

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

اقبال غلو کی حد تک ماضی پرست ہے وہ قرونِ اولیٰ کے سب مسلمانوں کو فقیر سمجھنے کے علاوہ تاریخ کے تمام ادوار سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو تعمیروان فقیر" خیال کرتا ہے حالانکہ اُسے بھی علم ہے کہ سلمان واقعی فقیر تھا جو رہتا یہ زندگی گذارتا تھا مگر مدائن کا گورنر بھی تھا اور سلیمان ایک نبی تھا نبی کی شخصیت عامۃ الناس سے ما بہ الامتیاز ہوتی ہے غالباً یہاں بھی وہ شکوہِ سلطانی کو معراجِ فقر یہ سمجھتا ہے کیونکہ وہ طغرلوں اور سنجروں کا بے پناہ عقیدت مند ہے ہاں کہیں کہیں اس کے اظہارِ بیان میں تضاد بھی دکھائی دیتا ہے

یہ ذکرِ نیم شبی ' یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

ذکرِ نیم شبی اور مراقبوں کے ساتھ سرور کا لفظ کچھ عجیب سا لگتا ہے کیونکہ ذکر اذکار اور مراقبے عالمِ ناسوت سے تعلق رکھتے ہیں اگر "سرور" خود فریبی کے نشے کا نتیجہ ہے تو ظاہر ہے کہ سالک ناسوتی عالم کی بالکل ابتدائی کیفیات میں مبتلا ہو کے رہ گیا ہے اور مصرع ثانی تو بالکل بے معنی سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ کہنا کہ اگر مراقبے ذکر اذکار اور "سرور" تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ۔ کیونکہ مقامِ لاہوت پر پہنچے بغیر حقیقی خودی ہاتھ نہیں آتی۔

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

اقبال کا یہ اندازِ بیان نہ صرف عامیانہ ہے بلکہ اس نے لاہوری طرزِ گفتگو میں یہ بات کہی ہے۔

جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

غالباً اقبال جسمانی وسیلے سے انجام دی جانے والی قوت کو قوت سمجھتا ہے حالانکہ اُسے معلوم ہے کہ ایک مردِ خدا اپنی بے پناہ تخیلی قوت سے ارض و سما کر متزلزل کر دیتا ہے اقبال کی

اس طنز میں عامیانہ پن پایا جاتا ہے کیونکہ جو شخص یہ لکھ سکتا ہے۔

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ "سیدھا کرے کوئی"

وہ یہ بھی کہ سکتا ہے
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو یاد کر
پنجابی میں بولتے ہیں "تینوں سیدھا کر دیاں گے"

البتہ غاروں، جنگلوں اور صحراؤں میں مقصد کے بغیر جا بیٹھنا یا محض اللہ کو یاد کرتے رہنا سراسر جہالت ہے کیونکہ اللہ ہی تو ایک راز نہاں ہے جسے جانے بغیر کوئی اپنے آپ کو بھی تو نہیں پہچان سکتا۔ انسان کے بغیر اللہ کچھ بھی نہیں۔ انسان ہی خدا ہے اور خدا ہی انسان ہے بشرطیکہ انسان ہو۔

وہ مرد مجاہد نظر کرتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

انسان کو اپنے آئینے میں اپنا ہی چہرہ نظر آتا ہے "گفتار کا غازی" سب کو ایسا ہی سمجھتا ہے اُسے ایک ایسے مردِ مجاہد کی ضرورت ہے جو اُس کے معیار کے مطابق ہو۔ اُس کا معیار کیا ہے؟ کہ اُس کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ بغل میں کتاب ہو اور انسانوں کے خون سے دریا بہا دے۔ مگر اقبال کو یہ علم ہونا چاہیے تھا کہ جب شعور انسانی ارتقائی منازل طے کر لیتا ہے تو محسوسات خمسہ بے کار ہو جاتے ہیں اُس کے ظہور کا دارو مدار نہیں۔ قوت عمل تدریجی طور پر ترقی پذیر ہے اور کوئی شے جتنی زیادہ لطف اختیار کرے اس میں اتنی ہی زیادہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے مثلاً آگ بھی جلا دیتی ہے۔

لیکن اسٹیم جو آگ سے لطیف ہے زیادہ طاقتور ہے الیکٹرک جو اسٹیم سے لطیف تر ہے اور زیادہ طاقت ور ہے اور اب تو اٹامک انرجی شروع ہو چکی ہے اٹامک انرجی الیکٹرک سے بدرجہا زیادہ قوی ہے جسم کے کسی عضو کے ذریعے سر انجام دیئے جانے والا فعل اتنا موثر نہیں ہوتا جتنا کہ خیال کی قوت سے سر انجام پانے والا۔ اور اس کے بعد روح کے توسط سے

جو کام کیا جائے اس کی قوت جسم اور ذہن سے بھی زیادہ ہے اور لامحدود۔

اب نہ جانے مستی کردار سے اقبال کی کیا مراد ہے؟

جبکہ وہ یہ بھی کہتا ہے

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اگر اقبال کی مراد مردِ مومن سے وہ انسان ہے جو عرفانِ حق سے مستفیض ہے اور اپنی باطنی قوتوں سے مسلح اور باخبر۔ تو ایسا انسان واقعی بے تیغ کیا بے توپ لڑسکتا ہے اور اگر اقبال اس شخص کو مردِ مومن سمجھتا ہے جو سیاست کے اکھاڑے میں آکر ڈنڈ پیلتا ہے اور اپنے حریفوں کو شاطرانہ چالوں سے پچھاڑنا چاہتا ہے تو اقبال جانے یا اقبال پرست۔

کیونکہ اقبال پرست "جناح" کو اُس کا مردِ مومن سمجھتے ہیں جس کے ہاتھ میں تیغ تو نہ تھی مگر وہ سیاست دان تھا اور سیاسی داؤ پیچ جانتا تھا وہ ماحول کی صدائے بازگشت تھا۔ اُسے ماحولی سیاست نے جنم دیا تھا سیاست تغیر پذیر ہے اور ماحولی حالات بدلتے ہیں۔ شخصیت پرستی کی اندھیرے کنوؤں میں مقید کردیا ہے یہ تخریت انسانیت کو برابر نگل رہا ہے۔

اقبال قلندر کو ایک مضطرب بے قرار اور بے آرام شخصیت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔

مرقد کا شبستان بھی اُسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہ خاک نہیں ہے
خاموشی افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائی افلاک نہیں ہے

دراصل انسان دوسروں کو بھی اپنی نفسیات پر محمول کرنے کا خوگر ہے یہ بات اقبال نے اپنے لئے بیان کی ہے ورنہ قلندر جو زمان و مکان سے پہلے ہی آزاد ہے تعینات سے نجات حاصل کئے ہوئے ہے جو پہلے ہی زندگی بے موت سے لطف اندوز ہوتا ہے اور عام لوگوں کی طرح نہیں جو مرنے کے بعد عمل ورد عمل کے نتیجے میں اپنے تحت الشعور کے مطابق ان گنت زمانوں تک مختلف چکروں میں گرفتار رہتے ہیں اس کا جسم چھوڑنا نہیں ہوتا اُسے تہ خاک کیا تکلیف ہوتی ہے تکلیف تو اُن لوگوں کے لئے مقدر ہے جو اپنے نظریات

دتصورات میں محدود ہیں۔ اگر قلندر بھی بے قید اور لامحدود نہیں۔ اور اُسے بھی قبر میں آرام حاصل نہیں۔ تو وہ قلندری کیا؟

منصور نے کہا "میں خدا ہوں یا میں حق ہوں" اور لوگ جو باطل پرست تھے حق بات سننے کی تاب نہ لا سکے چنانچہ جہلا نے اُسے پھانسی دے دی۔ گویا علاج کے ساتھ جہلا کا یہ سلوک ان کی جہالت کا زندہ ثبوت ہے۔ جس نے اپنے تجربے عظمت انسانی کا راز معلوم کیا۔ اور آخر کار خود مجسم رازِ حقیقت بن کر رہے افشا کیا تا کہ انسان اپنی حقیقی عظمت سے باخبر ہو جائے کیونکہ یہی رازِ قلندری ہے تو خود اقبال کو اس بات کا اعتراف ہے۔

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اِک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

لیکن تعجب ہے کہ حلاج جو خود مردِ قلندر تھا روایات کر رہا ہے کہ ایک مردِ قلندر نے رازِ خودی فاش کیا۔ وہ کون مردِ قلندر تھا یہ شعر انداز بیان کے لحاظ سے سقیم ہے خودی کی اصطلاح جو اقبال کا نظریہ ہے جسے جہلا نیا نظریہ قرار دیتے ہیں خود تشریح طلب ہے کیونکہ انسان میں دو روحیں روحِ حیوانی اور روحِ انسانی ہیں اسی کے مطابق اس میں دو طرح کی خودی ہے سچی خودی اور جھوٹی خودی یا انائے حقیقی اور انائے باطلہ سچی خودی کو انگریزی میں ریئل سیلف (REAL SELF) اور جھوٹی خودی کو (FALSE EGO) کہتے ہیں ان سے اوپر جو خودی ہے اُسے انائے کبیرہ یا سپریم ریئل سیلف کہتے ہیں۔

اقبال ان تینوں کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہ کر کے عام خواندہ طبقوں میں ذہنی الجھاؤ پیدا کرتا ہے عارفانِ حق خودی حقیقی Real Self ہی کے ترجمان ہیں۔ اور قلندر جو حقیقت میں شہنشاہِ ہفت اقلیم ہوتا ہے انائے کبیرہ Supreme Real Self کا ظہور ہے گویا وہ رب الارباب کا نمائندہ خاص ہے رب کئی ہیں مگر رب الارباب حی و قیوم، حاضر ناظر اور سمیع و علیم و بصیر ہے۔

عرفانِ ذات کا راز جب عام ہو جائے گا تو مذہب ختم ہو جائے گا اور مذہب کے نام پر پیٹ پوجا کرنے والوں کو دال نہ گل سکے گی۔ جب راز فاش ہو جاتا ہے تو راز نہیں رہتا

مگر ابھی لوگ ذہنی صلاحیت نہیں رکھتے عرفان ذات کا علم ان کے لئے صدمہ رساں ہے اقبال سچ کہتا ہے۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست
حدیث خلوتیاں جز برمز و ایما نیست

طالب صادق بت خانہ و کعبہ میں کوئی فرق نہیں دیکھتا کیونکہ وہ کعبہ کو جلوت جانانہ اور بت کدہ کو خلوت جانانہ سمجھتا ہے۔

حافظ گر وصل خواہی صلح کن باخاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

فرق انداز نگاہ میں ہے اور انداز نگاہ کو علم ذات تبدیل کر دیتا ہے جبکہ تحصیل نظری کے ساتھ ساتھ تحصیل عملی بھی شامل حال ہو۔ لیکن اپنا مسلک اس سے بھی کئی قدم آگے ہے بت خانہ رہے نہ رہے کعبہ، مسجد رہے نہ کلیسہ نہ آتش کدہ۔ بہر حال عبوری دور تک یہ اختلاف مظاہر ہے اس کے بعد یقیناً عالمگیر وحدت انسانی جلوہ ریز ہوگی۔

فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بت خانہ
ایں جلوت جانانہ آں خلوت جانانہ

(اقبال)

مگر جب علم کامل ہو جاتا ہے تو جلوت و خلوت کا فرق بھی مٹ جاتا ہے کیونکہ وحدت عالمگیر کسی لیمیٹیشن (محدودیت) کی متحمل نہیں۔ خود اسے بھی اس حقیقت کا احساس ہے۔

خود رانگم سجود بے دیر و حرم نمانده
ایں در عرب نمانده آں در عجم نمانده

(اقبال)

گو اس کے اس شعر میں لف و نشر مرتب کا لحاظ نہیں رکھا گیا کیونکہ دیر و حرم کی مناسبت سے پہلے عجم آنا چاہئے۔ اس کے بعد "عرب" مگر اقبال پر غالباً قافیہ تنگ ہو رہا تھا بہر کیف وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے خوب ہے۔

ایک عارف کہتا ہے

جس نے پہچانا ہے اپنے آپ کو
ہے نیاز اپنے قدم پہ سرنگوں

اپنے آپ کو سجدہ کرنا یا اپنے قدم پر سرنگوں ہونا طریقت کی ابتدائی منزل ہے کیونکہ عبودیت کے پایہ تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد سجدہ سجود کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے عاشق کا مسلک تو ترک وجود یا نفی ہستی ہے۔

باخدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ پنہاں و تو پیدائے من

اقبال رسول کو آشکار اور خدا کو پنہاں سمجھتا ہے اور یہ تصور ربوبیت (Conception of God) بالواسطہ (Indirect) ہے اگر اقبال انسانِ کامل کی عظمت سے بے خبر ہے جو ظاہر و باطن اور اوّل و آخر میں خدا ہے۔

رسول کا ظہور اُس قوم سے متعلق ہے جس کے لئے علم ذات سے زیادہ مذہبی جہالتیں دقیع ہیں کیونکہ رسول کا ظہور اُس قوم میں اُس وقت ہوا۔ جبکہ وہ قوم بتوں کو پوجا کو معیار دانش قرار دیئے ہوئے تھی اور بتوں کو مختلف ناموں سے موسوم کرتی تھی اس حالت میں رسولؐ نے انہیں جو تعلیم دی۔ وہ وقت کی مجسم کا علم بیان کرتا تو وہ قوم کیونکر مانتی؟ اس لئے اُس نے عوام کو ذہنی سطح کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے سب سے پہلے ان کی ذہنیت کو بلند کرنا ضروری سمجھا۔ اور اُسے منور کرنے کی طرف بالاختصاص توجہ مبذول کی۔ پہلے اصحاب خاص کو خاص نظرِ التفات سے علم ذات عطا کیا جو اس کی حقیقی عظمت کے راز سے باخبر ہو جاتے تھے مگر عام الناس کے لئے وقتی طور پر جو طریقہ باقاعدہ ترتیب دیا۔ اُس کو لوگ نہ صرف ایک ناقابلِ تغیر اور لاکلام نسخہ شفا سمجھنے لگے۔ بلکہ اس وقتی اور عارضی ڈسپلن کو حرف آخر سمجھ کر معیار صداقت بنا بیٹھے اور اسی کے مطابق کامل ہستیوں کو بھی پرکھنے لگے۔ جسے شریعت کا نام دیا گیا اس طرزِ عمل کی بناء پر مسلمان علماء نے جو حرکات مذبوحی روا رکھیں۔ اس کی تفصیل نہایت دلخراش اور تمسخرانگیز ہے۔

اس طریق کار کی بنا پر مذہب ایک سودا بازی یا تجارت بن کے رہ گیا۔ مذہبی یا شرعی طبقہ پیدا ہو گیا جس نے عوام کی راہ نمائی کا دعویٰ کیا جس نے کفن دفن مرنا جینا' شادی بیاہ اور نہ جانے کتنے امور کو اپنی تحویل میں لے کر ان کو ایسا رنگ دے دیا تاکہ قدم قدم پر جہلا اس طبقے کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔

اس کے پہلو بہ پہلو اس مذہبی طبقہ کے زیر اثر پیروں اور سجادہ نشینوں کے طبقے نے بھی جنم لیا۔ جو حقیقت سے کوسوں دور تھے مگر طبقہ جہلا یا عامۃ المسلمین کے روایتی علم کے مطابق اپنے آپ کو اس طرح جلوہ نما کرنے لگے کہ وہ اُن کی طرف کھنچے چلے گئے کیونکہ طبقہ عوام کے پاس کوئی معیار صداقت نہ تھا چنانچہ متصوفی اور پیران فرتوت نے اول الذکر طبقہ علماء کے تعاون سے عوامی معاشرے پر تسلط پا لیا۔ اس جاہلانہ بے عملی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ عوام الناس میں ایک اور طبقہ رونما ہوا۔ جو اس صورت حال کی صدائے بازگشت تھا۔ اور ایسا ہونا فطری بات تھی۔ اقبال اسی طبقے کا ترجمان ہے جس نے کہا۔

خوشتر ز ہزار پارسائی
گامے بہ طریق آشنائی

اور

بہ ہر زمانہ اگر چشم تو نکو گردد
طریق مے کدہ نہ شیوۂ مغاں و گراست

اقبال نے اس شعر میں حقیقت کا اعتراف کیا ہے کیونکہ قلندر وقت کے تغیر پذیر تقاضوں کے مدِ نظر اپنا رول ادا کرتا ہے اور "طریق مے کدہ و شیوہ مغاں" اور سے اور ہوتا ہے بھلا اس شرعی اور "مذہبی ماحول" میں کوئی باشعور انسان کیونکر خوش رہ سکتا ہے وہ کہتا ہے

نہ ایں جا چشمک ساقی نہ آنجا حرف مشتاق
زبزم صوفی و ملا بسے غمناک می آئم

سچ ہے جو طریقت کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ وہ اہل حقیقت کو کیونکر سمجھ سکتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اقبال قلندر کی عظمت سے واقف ہے کیونکہ اس کا علمی

مطالعہ مستحکم اور پائیدار ہے۔

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند
زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

لیکن اس دور قلندری میں قلندر خرقہ پوشی کو بھی سیدِ قلندری نہیں سمجھتا کیونکہ درحقیقت قلندری کسی خارجی علامت کو بھی متحمل نہیں۔ کیونکہ قلندر سراپا کبریائی حق کا مظہر کامل ہے اور رسم ورواج کا فطری مخالف بلکہ باغی رسم ورواج سے اقبال کی بغاوت قابل ستائش ہے قلندر نہ صرف جہانِ آب وگل مسخر کر لیتا ہے بلکہ وہ موت کو بھی تسخیر کرتا ہے۔ اقلیدس جو ماہر ہندسہ تھا دنیا کی تسخیر کا کوئی نکتہ تلاش کرتے کرتے محرومی کی موت مر گیا۔ مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ یہ نکتہ علم ذات ہے۔

اگر چشمے کشائی بر دلِ خویش
درونِ سینہ می بینی منزلِ خویش

اور بیدل کہتا ہے

چہ ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو چمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

جس بھید پایا قلندر دا
راہ کھو جیا اسے اندر دا

انسان کی عظمت کا راز اپنی نفسیات سے باخبر ہونے میں ہے کیونکہ جو اپنی نفسیات کو پہچانتا ہے وہی اپنے رب کو پہچانتا ہے سکندر جو مشہور فاتح تھا کسی قلندر ہی کی چشم کرم کا محتاج تھا عظمت انسانی کا راز بادشاہوں، سلطانوں، قیصروں، زاروں، مغلیوں، فاتحوں، جنگجوؤں اور حکمرانوں کی سفاکانہ تاریخ کے مطالعے میں مضمر نہیں۔ بلکہ عظمت و تقدیسِ انسانیت قلندروں کے قلندرانہ جاہ وجلال سے وابستہ ہے اسی بات کو اقبال نے بیان کیا ہے۔

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں

اگرچہ اقبال کو قدرت کاملہ کی طرف سے منصب قلندری نہیں ملا تھا مگر وہ رموز قلندری سے واقف تھا اور اُسے یک سوئی حاصل تھی۔ کیونکہ یک سوئی کے بغیر کوئی فنکار یا مفکر اظہار بیان پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ یک سوئی ہر شاعر و ادیب کو حاصل نہیں ہوتی۔ چونکہ اقبال نے یک سوئی حاصل کرنے کے لئے شروع میں یوگ و دیا کی مشقیں بھی کی تھیں چونکہ مشق کے بغیر یک سوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ اظہار بیان پر قادر ہے کیونکہ جب انسان کا ذہن ایک نظریے پر ٹھہر جائے تو وہ اپنے نظریے کی روشنی میں اپنا رول ادا کر سکتا ہے اور یہ جو راقم الحروف نے کہا ہے کہ وہ منصب قلندری پر فائز نہیں تھا۔ تو اس بات کو کوئی اقبال پرست ہو یا نہ ہو سمجھنے سے قاصر ہے اگر اقبال کا اندرون عالم لاہوت سے وابستہ نہ ہوتا۔ تو وہ بھی عام شعراء کی طرح ہوتا۔ مگر وہ فی الواقع اُس زمانے کے قلندر سے متعلق تھا اگرچہ خارجی طور پر اُسے معلوم نہ تھا کہ لاہوت کا مظہر مجسم کون ہے؟ لیکن اُسے اس امر کا شعور تھا۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

ورنہ اگر وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہوتا کہ یہ دور جہالت میں کون اُس کا ساتھ دے رہا ہے تو شاید وہ اپنی مسلمانی کے زعم میں اُسے قبول نہ کرتا لیکن قلندر تو سورجوں کا سورج ہے جس کے فیضانِ کرم کا مینہ گوہر بار ہر زرخیز سرشت پر ہوتا ہے خواہ وہ کسی جگہ، کسی ملک، کسی قوم یا کسی مذہب سے ہو۔ اقبال کو تمنا تھی اس کی تمنا میں زندگی، ایمان اور سچائی ہے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اُسے اِس بات کا محض اس سبب سے ادراک تھا کہ اُس کا باطنی طور پر لاہوت رشتہ تھا لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لاہوت وہ "حقیقت منتظر" ہی ہے جس کا جسم ہر دور بے آغاز و انجام کے اختتام پر ہوتا ہے۔

☆☆☆

اقبال کا مردِ مومن

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(غالب)

یہ جو کہا گیا کہ جو اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے "رب" کو پہچان لیتا ہے تو اس میں ایک عظیم ترین راز پنہاں ہے چونکہ مذہبی دُنیا خدا رب اور گاڈ وغیرہ کے الفاظ اختراع کر کے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دیتی چلی آئی ہے اس لئے جن لوگوں نے ایسی بات کہی انہوں نے ایسے ہی لوگوں کی نفسیاتی کیفیات کو پیشِ نظر رکھ کر کہی۔ ورنہ اگر وہ صاف صاف کہہ ڈالتے۔ کہ انسان ہی خدا ہے اور ہر فرد اپنے اعمال و افعال کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس لئے ہر فرد اپنا خدا ہے تو جہلا پر یہ اظہار حقیقت ناگوار گذرتا۔ جیسا کہ منصور نے جب حقیقت مجسم ہو کر کہا "میں حق ہوں" تو طبقہ جہلا نے اس کی اس نہایت اُونچی بات کا نہ صرف تمسخر اُڑایا۔ بلکہ اُسے مستوجب کا رودرسن قرار دیا۔ جس فرد نے بھی کوئی ایسی بات کہی ہے اس نے اپنے تجربہ و مشاہدہ ہی کی بنا پر کہی ہے چنانچہ جس نے کہا "جو اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے وہ خدا کو پہچان لیتا ہے" اس نے بھی یہ بات پیکر حقیقت ہو کر ہی کہی۔ البتہ کسی کی باتیں براہِ راست ہیں اور کسی کی بالراست۔ اس طرزِ اظہار میں مصلحت ماحول ہی پیشِ نظر رکھی جاتی رہی ہے لیکن اس مصلحت نے آگے چل کر براہِ راست سچی باتیں کہنے والوں کے لئے بے حد مشکلات پیدا کر دیں کیونکہ طبقہ عوام نے انہیں غلط تعبیر کا رنگ دے کر غلط معانی پہنائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہلا کے "محققین" ابھی تک اعلانِ حق کرنے والوں کو وجودی وغیرہ کے نام دیتے ہیں کیونکہ اس وقت بھی لوگوں نے انہیں ملحد، کافر زندیق اور دہریہ کہا تھا اس بات کو ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے کم از کم تذکرۃ الاولیاء (مصنفہ خواجہ فریدالدین عطار) کا مطالعہ کیا ہے۔ عام ذہنی سطح سے بلند ہو کر

جب کوئی بات کی جائے تو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

اقبال جسے دنیا میں عظیم شخصیت بننے کا خبط لاحق تھا اگر اپنی قلندری کو قوم پرستی میں نہ چھپا لیتا تو اُسے کون حکیم الامت کا خطاب دیتا حالانکہ اس کے اپنے افکار میں تضاد ہے کیونکہ وہ حقیقت کبریٰ سے واقف ہو کر بھی اس جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ جس سے مستقبل باخبر ہوئے بھی معاف نہیں کرے گا وہ ایک طرف عرب و عجم رنگ و نسل اور قوم و وطن کو بت پرستی قرار دیتا ہے۔اور ساتھ ہی قوم پرستی کی بنیادیں استوار کئے جاتا ہے بلکہ پاکستان کو جس کی بنیاد محدود قوم پرستی کے جذبے پر ہے اسی کے افکار عالیہ کا مرہون منت سمجھا جاتا ہے وہ وطنیت کے تحلیل کو رد کرنے کے باوجود ایک وطن بنانے کا حامی دکھ دیتا ہے اور حیوانی جذبات اور جوش و خروش کو قومیت کے نام پر ابھارنا مفکرانہ فرض سمجھتا ہے اسلام جو عربی کا لفظ ہے جس کے معانی کچھ بھی ہوں۔مگر مسلمان قوم تو اسے اپنی ذاتی اور لمیٹڈ جاگیر سمجھتی ہے عالمگیر اخوت کا داعی ہے حالانکہ یہ بات عملی طور پر تاریخی عوامل اور شہادتوں کی موجودگی میں غلط ثابت ہو چکی ہے خود عربوں میں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی نسل قوم اور خاندان کی بنیادوں پر علی حالہٖ چپقلش موجود ہے۔

اقبال جانتا تھا کہ اس جذباتی قوم کو جو بالخصوص پاکستان میں بستی ہے اسی قسم کے نعروں سے خوش رکھا جاسکتا ہے جو اس کے مرنے کے بعد شخصیت پرستی کا بت بنا کر اُسے حکیم مشرق، حکیم الامت اور نہ جانے کن کن خطابات سے نوازتی ہے اور اس کے عقیدت مندوں میں ایسے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو پروفیسر اور بزعم خویش نقاد محقق اور پی ایچ ڈی ہیں انکے دماغوں پر اقبال مسلط ہے وہ اخباروں اور رسالوں میں اقبال پر بے تحاشا مقالات سپرد قلم کر کے طبقہ جہلا پر اقبال کے ساتھ اپنی علمیت کا سکہ بھی بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔مثلاً ایک پی ایچ ڈی نے "اقبال کا مرد مومن" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر ثابت کیا ہے کہ اقبال کا مرد مومن "انسان کامل" ہے حالانکہ ہر شخص جسے روحانی علم و دانش حاصل ہو سمجھ سکتا ہے کہ انسان کامل صرف نبی یا اوتار ہوتا ہے انسان کامل کی عظیم ترین اصطلاح کو کما حقہ سمجھنے کے لئے تصوف یا علم ذات کا مطالعہ لازمی ہے ورنہ پی ایچ ڈی حضرات ہر مرد مومن کو انسان کامل کہہ دیں گے۔

جس طرح نطشے ایک فوق البشر (Supperman) کو اپنی امنگوں اور نظریوں کا

محور بنتا ہے اسی طرح اقبال مردِ مومن کا انتخاب کرتا ہے مردِ مسلمان، مردِ مومن اور مردِ قلندر میں اگر کوئی فرق نہیں۔ تو عوام اور خواص میں بھی کیا فرق ہے؟ سنگ ریزوں اور جواہر پاروں میں کیا امتیاز ہے مگر اقبال پرستوں کو مردِ مسلمان اور مردِ فقیر یا مردِ قلندر میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل پروفیسر یا پروفیسر قسم کے لوگوں کو طبقہ عوام نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ علم وادب کی سند ہیں۔ چنانچہ وہ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو کچھ ہرزہ سرائی کرتے ہیں اسے الہامی کا درجہ دیا جاتا ہے یہی دیگر شعبوں کا بھی حال ہے اگر کوئی جج یا بیرسٹر وغیرہ بدقسمتی سے اہلِ قلم کے زمرے میں شمار ہونے لگتا ہے یا اُسے شمار کیا جاتا ہے تو وہ اپنی کرسی اور اعزاز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علم وادب میں بھی داخل ہو جاتا ہے اور پڑھے لکھے جہلا اُسے سرآنکھوں پر بٹھاتے ہیں حالانکہ دنیاوی اعزازات عہدے اور منصب کا علم وادب سے کیا واسطہ؟

مگر رسالے دیکھو تو ان لوگوں کو جگہ دی جا رہی ہے اخبارات دیکھو تو انہیں امتیازی مقام عطا کیا جا رہا ہے اور ادب یا ثقافت وغیرہ کی مجالس پر نگاہ ڈالو تو انہیں صدارت کی کرسیوں پر بٹھایا جا رہا ہے حالانکہ اُن کے مر جانے کے بعد اُن کے نام ذہنوں سے مٹ جاتے ہیں گویا آج مرے کل دوسرا دن۔ کالجوں کے پروفیسر دیکھو تو نقاد بنے بیٹھے ہیں۔ جاہل قسم کے لوگ رسالوں کے ایڈیٹر بن جاتے ہیں جو اناپ شناپ لکھے چلے جاتے ہیں علم وادب کی خدمت سے زیادہ دیگر قسم کی منفعتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں چونکہ تھوڑا علم خطرناک ہوتا ہے اس لئے وہ انہیں اہلِ قلم کو اپنے رسالوں میں جگہ دیتے ہیں جو اُن کے مفروضہ معیار پر پورے اترتے ہوں۔ یہی حال اکثر وپبلشر اور ناشرین کا ہے جن میں سے اکثر ناخواندہ اور "چٹے" اَن پڑھ ہوتے ہیں جو علم وادب کی خدمت کے مقصد سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ وہ دکاندار اور تاجر ضرور ہیں اپنے جیسے صلاح کاروں اور مشیروں کے محتاج ہیں۔

ہر مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کو تمام مذاہب پر فوقیت دیتے ہیں اور ایسا کرنے کے لئے ہر ایک کے پاس منطقیانہ دلائل ہیں ایک تو ویسے بھی ہر شخص اپنی عقل اور فیصلے کو مستند سمجھتا ہے اور جب اُس پر مذہب کی رنگ آمیزی ہو جاتی ہے تو اس کی قوتِ فیصلہ عقائد کا جامہ پہن کر زیادہ جذباتی ہو جاتی ہے چونکہ محدود ذہن کے مالک مذہب کو ذریعہ نجات قرار

دیتے ہیں اس لئے ہر مذہب کے پیروکار اپنے آپ کو نجات یافتہ اور دوسروں کو مورد عتاب سمجھتے ہیں جس کے نتیجے میں کل ارضی پر نوع انسانی یا ملت انسانیہ ذہنی طور پر بے حساب فرقوں میں منقسم ہو چکی ہے اس نظری اختلاف کا نتیجہ ان گنت مصائب کی صورت میں رونما ہے چنانچہ دنیا میں تمام تر مصیبتوں کی بنیاد مذہب اور صرف مذہب ہے عجیب بات ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والے کسی نجات دہندہ کے منتظر ہیں حالانکہ جب وہ آتا ہے تو ہر مذہب کے ماننے والے اُسے اپنے محدود اور روایتی معیار پر نہیں پاتے اسلئے اُسے نہیں پہچانتے تو اقبال "مردِ مومن" بھی شاید کوئی "حقیقتِ منتظر" ہے حالانکہ اُس کا خواب کب کا شرمندہ تعبیر ہو چکا ہے وہ اپنی زندگی میں بھی یہ دیوانے کا خواب دیکھتا ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آلباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

پڑھے لکھے اور پڑھنے پڑھانے والوں کا ایک طبقہ تو اقبال ہی پر ریسرچ کرتا رہتا ہے گویا اقبال ایک مافوق البشر شخص تھا جس کا کلام سمجھنا بہت ہی مشکل ہے دراصل ماضی پرست قومیں اپنے محدود فکر و نظر کی تخلیق کو شخصیت پرستی کا رنگ دے کر اس کے نام کا استحصال کرتی ہیں اس طرح انہیں یہ فائدہ خاص طور پر حاصل ہوتا ہے کہ عوام کی ذہنیت اُس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر شکم پروری اور منفعت اندوزی کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ اس کی باتوں کو کتاب و سنت کی روشنی میں فرمودہ الٰہی قرار دینے میں بھی کوئی تامل نہیں کرتیں۔

رفتہ رفتہ یہ شخصیت پرستی خطرناک حد تک اپنی جڑیں عوام کے دلوں میں اُتارے چلی جاتی ہے تاکہ آخر کار اُس کے نام پر ایک الگ فرقہ بن جاتا ہے اُس کی قبر زیارت گاہ بن جاتی ہے لوگ جس کے مجاور بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اقبال کا "مردِ مومن" کوئی پیدا ہو یا نہ ہو۔ مگر اس نے ایک نئی اپج تو پیدا کر دی۔ وہ مسلمانی کی تعریف یوں کرتا ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہر انسان میں جیو آتما (روح حیوانی) اور روح انسانی ہے غصہ لالچ اور شہوت روح حیوانی کی خاصیت اور قدوسیت روح انسانی کی صفت ہے گویا ہر انسان منفی طاقت (Negative Power) اور مثبت قوت Positive Power کا مرکب ہے چونکہ انسان خالق کائنات ہے اس لئے اس میں تخلیقی جوہر ہیں اور اُس کے باطن میں لا محدود فیضے۔

لفظِ مسلمان'' کا لیبل 'قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت کے ہیولے پر چسپاں کر دیتا ایسا ہی ہے جیسے چاند کو کوئی'' مہتاب خان اور سورج کو''مہر دین'' ہو لگ جائے دراصل اقبال پر روایات کا بھوت سوار ہے اور وہ ماضی پرستی کے مرض میں اس حد تک مبتلا ہے کہ سلاطین خلفاء ملوک بادشاہوں اور دیگر قسم کے اجارہ داروں کو بھی عقیدت کی عینک پہن کر دیکھنے کا عادی ہے وہ لفظ مسلمان اور مومن کی معنوی تعبیر یکساں انداز سے کرتا ہے حالانکہ مسلمان ایک ایسی زبان کا لفظ ہے جس کو عجم میں مادری زبان ہونے کی سعادت حاصل نہیں۔ مگر مسلمان اس زبان کو آکاش بانی سمجھتے ہوئے تمرکا میاں مٹھو بن کر پڑھتے ہیں حالانکہ اُنہیں اس کے معانی کی ذرا بھی شدہ بدھ نہیں۔ مسلمان اُس عام طبقے کا نام ہے جو زبان سے کلمہ پڑھ کر ایک ایسے ٹولے یا جماعت میں تبدیل ہو جاتے ہیں جہاں لا تعداد فرقہ بندیاں موجود ہیں اور ہر فرقہ دوسرے کو مردود سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو راستی پر پاتا ہے یا بالفاظ دیگر ہر اس شخص کو مسلمان کہتے ہیں جو کلمہ پڑھ کر ایک روحانی اجارے میں شریک ہو جائے۔ خواہ وہ کلمے کے معانی سے کتنا ہی بے خبر ہو؟ اس نکتہ نگاہ سے منافق بھی مسلمان ہیں اور مشرک بھی۔ مگر اقبال کے نزدیک مسلمان وہ ہے جس میں قہر بھی ہو۔ رحم بھی۔ قدوسیت بھی اور جبروتی انداز بھی۔ اُس نے یہ تخیل تاریخ اسلام سے مستعار لیا ہے حالانکہ تاریخ کی کوئی کتاب بھی ایسی نہیں۔ جسے مورخین نے قصوں کہانیوں کی الف لیلیٰ نہ بنایا ہو۔

تاریخ کا مطالعہ ایک عام انسان کو حیوانی جذبات کا پیکر متحرک بنا دیتا ہے اُس کے ذہن سے تحقیق و تخلیق کے جوہر غصب کر لیتا ہے اور اُسے محدود نکتہ نگاہ کا قائل بنا کے رکھ دیتا ہے کیونکہ تاریخ ہمیشہ انسان کا فرو گذاشتوں کی ایک طویل ترین روئیداد ہے۔ اگر مرد

مومن سے مراد مردِ عارف ہے تو مسلمان کی محدود ترین اصطلاح مردِ عارف پر منطبق کرنا گیدڑ کو بھیڑیا کہنا ہے کیونکہ دونوں میں بہت حد تک ظاہری مشابہت ہے۔

دراصل قرونِ اُولیٰ میں مسلمان اُس جماعت یا گروہ کا نام تھا جنہیں عرفانِ ذات حاصل نہیں تھا مگر انسانِ کامل (رسول) کی بے پناہ قوتِ تسخیر کے زیرِ اثر تھے یہ وہی لوگ تھے جو اس سے پہلے حیوانی جذبات کی مجسم تفاسیر تھے مگر اُن کے ان جذبات اور خصائص کو نبی کی تربیت نے ایک ایسا رنگ دے دیا تھا جو اُن کی فطری اور جبلی صفات کا ردِ عمل تھا مثلاً ڈاکوؤں لٹیروں قزاقوں اور جنگجوؤں کو اس روحانی قوتِ تسخیر نے سپہ سالار، حاکم، فرمانروا، سپاہی اور جانباز بنا دیا تھا کیونکہ ایک ڈاکو سدھر کر بھی ڈاکو ہی رہتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی ڈکیتی کا اسلوب بدل جاتا ہے اور اصطلاح میں ڈاکو کی بجائے کچھ اور کہلاتا ہے سکندرِ اعظم کی افواج جب پے در پے حملوں کے بعد ایک بہت بڑے ڈاکو کو گرفتار کر کے اُس کے حضور لائی تھیں تو سکندر نے اُس سے وہی سوال پوچھا تھا جو اس کی عادت میں داخل تھا" اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" تو اُس نے بڑی دلیری سے جواب دیا تھا" جو ایک سردار دوسرے سردار سے کرتا ہے" اس پر سکندر نے اُسے اپنی فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا تھا اب وہ مہذب ڈاکو تھا جس کی فطری صلاحیتیں ہر میدان میں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ سکندرِ اعظم بھی اپنے وقت میں ایک بے پناہ قوتِ تسخیر کا مالک تھا کیونکہ کوئی قوم اس کے بغیر اپنے چھوٹے سے ملک کی سرحد سے باہر قدم نکال کر اقصائے عالم پر نہیں چھا سکتی۔

بعینہٖ جاہل عربوں کی فطری صلاحیتوں کی قلبِ ماہیت کر کے اُن سے محیر العقول کام لے لئے گئے تھے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ حقیقت کی روشنی سے انکار کرنے والے مسلمان کیوں صاف صاف نہیں کہہ دیتے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا تھا مگر اس شمشیر کی چمک دمک میں زمانہ جہالت کے عربوں کی قلبِ ماہیت کارفرما تھا۔

اگر اقبال کا مردِ مسلمان، مردِ مومن، مردِ فقیر اور مردِ قلندر وہ ہے جو" خودی" کے جوہروں سے متصف ہو تو اقبال کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ ان سے متصف ہونے کے لئے معرفتِ ذات کا حصول لازمی ہے قرونِ اولیٰ کے مسلمان معرفتِ ذات کا علم تو نہیں رکھتے

تھے مگر معرفتِ ذات کے سرچشمہ فیضان سے سیراب تھے جنہیں باقاعدہ علم معرفت بھی حاصل تھا اور انہوں نے خاص تربیت کا کورس بھی پاس کیا تھا وہ معدودے چند ہی تھے معرفتِ ذات کے اسرار سے سب باخبر نہیں تھے کیونکہ ان اسرار نہاں کا متحمل ہونے کے لئے تربیت ذہنی درکار ہے لیکن طرفہ تر ماجرا یہ ہے کہ اقبال چودہ سو برس پہلے کے جاہل عربوں پر سب اہل عجم و عرب پر محمول کر کے چاہتا ہے کہ وہ جاہلیت کی جبلتوں' عادتوں' صفتوں اور صلاحیتوں کو قلب ماہیت کر کے پھر جہانگیر جہاندیدہ و جانباز بن جائیں۔ حالانکہ چودہ سو برس پہلے کا ماحول ارضی زمان و مکان کے مطابق جدا اور مختلف تھا اور اب شدا نوعیت رکھتا ہے اُس وقت ہوائی جہاز تھے نہ راکٹ نیز ٹیلی ویژن، ٹیلی فون' ریڈیو' مائیکروفون اور وائرلیس موجود نہ تھے اُس وقت یہ آلات وحرب بھی تو نہ تھے اب ایٹم بم کے علاوہ کئی اور مختلف قسم کے بم ایجاد کر لئے گئے ہیں جو ذرا سے وقفے میں شہروں کے شہر اور ملکوں کے ملک تباہ کر سکتے ہیں اس وقت تیغ و تفنگ تھے اب ایسی رائفلیں اور گنیں ایجاد کر لی گئی ہیں جو میلوں کے فاصلے سے پوری رجمنٹ کا صفایا کر سکتی ہیں۔ وہ جسمانی قوت کی برتری کا زمانہ تھا یہ ذہنی قوت کا ارتقائی دور ہے اگر اُس وقت کوئی روحانی کمال کا مظاہرہ کرتا تھا تو اُسے مافوق البشر سمجھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں وہی کمال ذہنی قوتوں کے ساتھ ساتھ وابستہ ہے اور عوام چنداں متعجب نہیں ہوتے گویا ایسے کمالات وقت کی روزمرہ زندگی کا جزو بن چکے ہیں اگر اُس وقت کوئی روحانی انداز سے کئی سو میل کے فاصلے سے اپنے سالار عساکر کو ڈائرکٹ کر سکتا تھا۔ اور اس کی آواز باقی لوگ بھی سنتے تھے اور اس بات کے انکشاف پر حیرت زدہ ہو جاتے تھے تو آج سائنسی آلات وہی بلکہ اُن سے زیادہ عظیم کام سر انجام دے رہے مثلاً ریڈیو' وائرلیس اور ٹیلی فون وغیرہ۔

اگر اُس وقت کوئی مردے کو زندہ کر دیتا تھا تو اُسے لوگ جہالت کی وجہ سے خدا کا شریک سمجھ کر تختہ دار پر لٹکا دیتے تھے مگر آج اسی قوم کے معجزے میڈیکل سائنس سے سرزد ہو رہے ہیں امریکی اور روسی سائنس دان مردوں کو زندہ کر رہے ہیں۔

لہٰذا اقبال کا "مردِ مومن" روایتی ہے جو اس زمانے کے معیار پر قطعی پورا نہیں اُترتا۔

یہ ذہنی برتری کا زمانہ ہے جسمانی قوت کی فوقیت "داستان امیر حمزہ" بن چکی ہے کیونکہ اب تو جس کا راکٹ چاند تک پہنچ جائے گا۔ وہی جہانگیر و جہان بان ہے۔ جس کے پاس زیادہ قوت تسخیر ہے وہی جہان آب و گل کا حاکم مطلق ہے۔

اگرچہ اقبال نے سر قلندری پالیا تھا۔ اور اس کے قول کے مطابق اس کا رشتہ لاہوت سے بھی قائم تھا۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

لیکن اس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو خلاقانہ رنگ دینے کی بجائے روایت پرستی کو نذر کر دیا۔ اور اپنی قلندری کو قوم پرستی کے محدود تخیل میں چھپا لیا عام انسان اپنے تحت الشعوری رجحانات کی حکم برداری کرنے پر مجبور ہے کیونکہ لاشعور اس کے تحت الشعور ہی سے کام لے سکتا ہے اگر تحت الشعور ماضی کے بے مصرف خیالات سے ممیز ا ہے تو مفکر کو بالکل نئے طرز معمار اور اخلاق بنا دیتا ہے اقبال نے رومی کو اپنا راہبر اور مرشد بنایا۔ ظاہر ہے کہ رومی نے اپنے ماحولی تقاضوں، محرکات اور اثرات وغیرہ کے مطابق معرفت ذات کا درس دیا۔ وہ اس معاملے میں پیغمبرانہ صفات کا مالک ہے مگر اس دور میں اس تمثیلی انداز بیان کی ضرورت ہے نہ طبیعت پر اکتاہٹ طاری کر دینے والے ستالاتی طرز اظہار کی۔ کیونکہ یہ دور اختصار پسند ہے۔ سائنس مادی طور پر بھی زمان و مکاں کے فاصلے ختم کرتی چلی جا رہی ہے تو اس دور جدید میں رومی کی ضرورت ہے نہ اقبال کے متصورانہ "مرد مومن" کی۔

اقبال قلندر نہیں تھا

کیونکہ "اقلیم روحانی اُسے قلندر تسلیم نہیں کرتی، قلندر وہ ہے
جسے زمانے بھر کی روحانی ہستیاں قلندر مانیں جسے کامل مست،
مجذوب، قطب اور ابدال وغیرہ اپنا روحانی حاکم یا شہنشاہ کہیں"
(صائب عاصمی)

فلسفہ وجودیت

اِک خیال' اِک ذہن' اِک دل' اِک نظر اور اِک وجود
اختلافاتِ مظاہر بے حقیقت ہیں تمام

(صائب عاصمی)

گذشتہ دنوں ایک پی ایچ ڈی صاحب کا مقالہ بعنوان "کیا وجودی تھے؟ میری نظر سے گذرا۔ جو سہ ماہی رسالہ "فنون" لاہور میں شائع ہوا ہے صدیاں گذر جانے کے بعد بھی یہ لوگ انہیں متنازعہ فیہ مباحث میں تضیع اوقات کر رہے ہیں کیونکہ اسی قسم کے بحث پہلے بھی کافی وقت تک موجود رہے ہیں چنانچہ ابن عربی اور شہاب الدین سہروردی وغیرہ نے اپنی تصانیف میں ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

حالانکہ یہ ایک سیدھی سادی بات ہے کہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے مطابق جو اپنے وجود اور اپنے وجود کی نفسیات کو پہچان لیتا ہے وہ رب کو پہچان لیتا ہے کیونکہ رب وجود سے الگ ہے نہ جو رب سے ظاہری وجود کے بے جان ہو جانے کے بعد وجود ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ ظاہری وجود کے تمام اثرات میں موجود ہے۔

وجودی کیفیات کے مطابق مرنے کے بعد جو وجود مرتب ہوتا ہے وہ ان کے مطابق لطافت یا کثافت کی کسی ڈگری ہی کا حامل ہوتا ہے کیونکہ زندگی ختم نہیں ہوتی ۔ مادہ (ENERGY) زندگی ہی کا ظہور ہے مادہ اپنی شکلیں بدلتا ہے مگر فنا نہیں ہوتا۔ یہ اس کا شکلیں بدلنا اس کی مادی کیفیات ہی کے مطابق ہے جسے عرفِ عام میں موت کہتے ہیں۔ وہ دراصل مادّے کو ارتقا پذیر بنانے ہی کا وسیلہ ہے اس لئے اگر اقبال وجودی تھے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر نہیں تھے تو بھی مسلمات میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوتا۔

اب فرق صرف اتنا ہے کہ بعض مفکروں نے ظاہری وجود پر اپنے فکر و نظر کا انحصار

رکھتے ہوئے حیات بعد الموت کی کیفیات کی طرف سے ارادتاً چشم پوشی کی یا عمداً اجتناب برتا۔ کچھ بھی ہو۔ یہ بات ایک امر واقع ہے کہ جو تغیر پذیر ہے اور محض ظاہری وجود پر انحصار رکھنے والی نگاہ بھی وجود عناصر سے متعلق ہے اور یہ عناصر کل عالم اشیاء میں مشترک حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ اسی نکتہ نگاہ سے ہر وجود کل کا خلاصہ اور ترجمان ہے گویا قطرہ سمندر کا اور ذرہ صحرا کا سروسامان رکھتا ہے۔

عالم اشیاء میں صرف انسان ہی ایک ایسی تخلیق ہے جو دیگر انواع مخلوقات میں ممتاز ہے کیونکہ انسان نہ جانے کتنے اور ان گنت زمانوں کے بعد یہ ہیئت اختیار کر سکا ہے اُس کا جسم ذہن اور روح ارتقائی مدارج طے کرتے رہے اُس کا وجود کسوت انسانی میں دکھائی دیا۔ چونکہ اس میں ان گنت زمانوں کی جبلی کیفیات گوناگوں موجود ہیں اس لئے ذہنی طور پر وہ ابھی پوری طرح ایک مہذب اور باشعور جانور نہیں بنا ہے کیونکہ اُس کا لاشعور اُس کے تحت الشعور کے تابع ہے اور اُس کا تحت الشعور ماضی کے اندھیروں کی وجہ سے ہنوز ظلمت کدہ ہے گھاس پھوس کی طرح پیدا ہونے والے ان گنت انسانوں میں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں جو ذہن کی ارتقائی کیفیات سے باخبر ہیں اور اپنے تحت الشعور کو تخلیقی و تعمیری تجلیات کا سر چشمہ انوار بناتے ہیں جن کا لاشعور تحت الشعور کے بس میں ہونے کی بجائے ان کی اپنی قوت ارادی کے زیر اثر ہے۔

درحقیقت کائنات ارضی و سماوی وجود واحدہ ہے اور انسان اس میں ایک عظیم ترین کارکن (Factor) کی حیثیت رکھتا ہے جب اُسے یہ علم ہو جاتا ہے کہ وہ اور کائنات مختلف نہیں۔ تو اس کا علم کامل ہو جاتا ہے ویسے بھی انسان کے جسم پر نگاہ ڈالئے اور اس کا بغور تجزیہ کیجئے۔ ایک صحت مند اور توانا انسان کے سر پر جتنے بال ہیں اتنے ہی انسان روئے زمین پر آباد ہیں۔ انسان کے سوا اور کوئی مخلوق اپنا سر اوپر اُٹھا کر بخط مستقیم نہیں چلتی۔

یہ دو ٹانگوں' دو بازوؤں اور دو ہاتھوں والا جانور اپنے شانوں پر اپنا سر اُٹھائے اور سر میں ذہن لئے سیدھا اوپر کی طرف مائل پرواز معلوم ہوتا ہے ورنہ چوپائے اور دیگر مخلوق اپنا سر زمین کی طرف جھکائے ہوئے چلتی ہے مگر انسان کی عظمت مابہ الامتیاز ہے زمین کے

ساتھ جو مخلوق ہے وہ نباتات ہیں جو جمادات سے اعلیٰ ہیں کیونکہ جمادات کی حرکت عمل اور نشو ونما کی رفتار بھی سست ہے دوسرے نمبر پر نباتات ہیں جن کی حرکت عمل اور نشو ونما اول الذکر سے امتیازی ہے تیسرا نمبر نوع حیوانی کا ہے نباتات زمین کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ اپنی خوراک جڑوں کے ذریعہ زمین سے حاصل کرتے ہیں مگر چل پھر نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کی حرکت عمل محدود ہے لیکن حیوانات کی سطح ان سے بلند ہے کیونکہ اس مرحلے پر پہنچ کر یہ نسبتاً ارضی زنجیروں سے آزاد نظر آتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا سکتے ہیں ان کی حرکت عمل نسبتاً محدود بھی نہیں۔

نوع حیوانی کی حرکت عمل کے مطابق اس کا ذہن بھی اسی حد تک محدود ہے چوتھا نمبر نوع انسانی کا ہے نوع انسانی ارضی زنجیروں سے نسبتاً بہت آزاد ہے اور حقیقت میں اُسے قطعی آزاد ہو جانا چاہئے۔ نوع انسانی کی حرکت عمل باقی مخلوقات کی نسبت محدود نہیں۔ بلکہ لامحدود ہے اس مرحلے پر ذہن انسانی نسبتاً آزاد ہے اور اپنے اعمال کا بھی آپ ذمہ دار ہے اور اپنے ہی آگے جوابدہ ہے کوئی خارجی یا بیرونی طاقت اس کے افکار و اعمال کی محرک ہے نہ ذمہ دار انواع جمادات' نباتات' حیوانات اور نوع انسانی کے دائرے سے مختلف ہیں ان کی نفسیات' طبعی رجحانات اور ضروریات بھی مختلف ہیں۔ جو خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں انسان کے سوا ہر نوع مخلوقات کی غذا جسمانی ہیئت و ساخت محل وقوع اور آب و ہوا کے مطابق مقرر ہے اور عجب بات یہ ہے کہ ہر نوع اپنے سے پست تر مخلوق کو خوراک بناتی ہے مثلاً نوع حیوانی سے تعلق رکھنے والی بیشتر مخلوق نوع نباتات پر گذر اوقات کرتی ہے بھیڑ بکریاں گھاس پھول' پھل پھول اور پتوں وغیرہ کی قسم کھاتی ہیں اور نوع نباتات اپنی جڑوں کے ذریعہ نوع جمادات کو بطور غذا استعمال کرتی ہے نوع حیوانی میں سے جو نسبتاً برتر مخلوق مثلاً شیر اور چیتے وغیرہ ہیں ان کی برتری ان کے جسم سے بھی نمایاں ہے چنانچہ وہ گوشت خور ہیں اور گھاس وغیرہ نہیں کھاتے۔ آخری نمبر نوع انسانی کا ہے چونکہ یہ دیگر مخلوقات سے افضل ہے اس لئے بقایا مخلوق اس کے تابع ہے نوع حیوانی سے تعلق رکھنے والی نسبتاً برتر مخلوق اپنی نوع کی باقی ماندہ مخلوق پر غالب ہے نوع نباتات میں بھی جو درخت اور پیڑ اپنی نوع کی

مخلوق سے نسبتاً برتر حیثیت رکھتے ہیں اپنی مخلوق کو بھی غذا بناتے ہیں ان کے اردگرد اور سائے میں جو پیڑ اور درخت ہوتے ہیں وہ ہمیشہ نباتاتی امراض کا شکار رہتے ہیں اور پنپ نہیں سکتے اس کے علاوہ انہیں مناسب غذا حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے جلدی سوکھ جاتے ہیں نوع حیوانی کی پست ترین اقسام سے تعلق رکھنے والی مخلوق اپنی ہی نسل اور اولاد کو بے دریغ چٹ کر جاتی ہے نوع انسانی میں تمام مخلوقات کی صفات موجود ہیں۔ جمادات کا جمود بھی ہے، نباتات کا نمو بھی۔ حیوانات کی صفات بھی ہیں اور ان کے خصائص بھی۔ لیکن اس کے باوجود کسوت آدمی میں جلوہ گر ہونے کے بعد یہ اپنے اعمال و افعال کی آپ ذمہ دار ہے۔

ان گنت زمانوں کے بعد کوئی پتھر لعل بن جاتا ہے اور بتدریج ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد بیش قیمت لعلوں میں شمار ہوتا ہے ان گنت زمانوں کی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد کوئی پیڑ بہترین انواع نباتات میں شامل ہوتا ہے لاتعداد زمانوں کے بعد حیوانات کی کوئی قسم بہترین اور نسبتاً باشعور حیوانوں میں شامل ہوتی ہے اسی طرح ان گنت صدیوں کے بعد نوع انسانی میں کوئی شخص شعبہ انسانیت کی بہترین فہرست میں شمار ہوتا ہے اور کوئی ایک انسان انسان کامل کا فطری اعزاز حاصل کرتا ہے بس اس شعبے سے تعلق رکھنے والے انسانوں ہی کو اس کی عظمت و تقدیس کی خبر ہوتی ہے ہر نوع مخلوقات کا ایک نمایاں پہلو ہوتا ہے جس میں اس کا ہیڈ ہوتا ہے مگر نوع انسانی کے اس شعبے کا سربراہ انسان کامل ہے جو نہ صرف کل نوع انسانی کا فطری راہ نما ہوتا ہے بلکہ اس کے علاوہ باقی انواع تخلیقات کا بھی سپریم ہیڈ ہوتا ہے ایمان کوئی اکتسابی یا غیر فطری جذبہ نہیں۔ بلکہ شعور کی یہ وہ داخلی کیفیت ہے جو انسان کو دیگر انسانوں سے ممتاز کرتی ہے ایمان کا ماخذ علم ذات ہے اور علم ذات کا سرچشمہ انسان کامل کے ذاتی اور آفاقی تجربات عمل ہیں۔

اگر حقیقت منتظر" سے مراد انسان کامل کا ظہور ہے تو بجا ورنہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اقبال انسان کامل کی عظمت و تقدیس سے عملاً باخبر تھا نہ اس کے ارادات مندی ہی آگاہ ہیں۔ دراصل نطشے کا مافوق البشر یہی انسان کامل ہے جو اپنی حقیقی عظمت سے باخبر ہوتا ہے اگر کوئی اور اس کی حقیقت اکبری سے عملاً باخبر ہے تو وہ پانچ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو ہمیشہ کائنات

انسانی میں موجود رہتی ہیں جنہیں عوام کی مذہبی زبان میں پنجتن کہا گیا ہے۔

انسان کامل کے مجسم ظہور پر دائرۂ امکان مکمل ہوتا ہے جو خود کائنات ہے بلکہ خلاصہ کائنات یہی وہ عظمت مآب ہستی ہے جسے مذہبی دنیا خداوند بھی کہتی ہے مگر اس قسم کی اصطلاحوں کو معنویت سے علماء بے خبر ہوتی ہے۔

یہی وہ شخصیت ہے جس کے نام پر مذاہب بن جاتے ہیں حالانکہ وہ ان سے ورا الورا ہے۔

اقبال وجودی تھے یا نہیں تھے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ''مردِ مومن'' کی کوئی قطعی تعریف کرنے سے قاصر ہیں وجود سے باہر کچھ نہیں انسان کا وجود ان گنت خلیوں (Cells) سے مرکب ہے اور جس قدر خلیات ہیں اتنی ہی کائنات میں دنیائیں ہیں۔ جس طرح کائنات ان گنت دنیاؤں سے مرکب ہے اسی طرح وجودِ انسانی بھی بے شمار کائناتوں کا خلاصہ ہے۔ جس طرح کائنات بے شمار اجزا سے بنی ہے اسی طرح انسان کا وجود بھی لاتعداد اجزا سے ترکیب پاتا ہے اس کے وجود کے ہر خلیے کا باقی تمام خلیات سے مساویانہ اور مربوط تعلق ہے جس طرح بے کار ذروں سے مل کر صحرا بنتا ہے اور لاتعداد قطروں کا نام سمندر ہے۔ اسی طرح بے شمار خلیوں کا نام وجود ہے اس کے اندر جو جوہر ہے وہ جوہر بسیط ہے یہ جوہر بھی سدا واحد لا محدود ہے۔

مغرب کی ترقی کا راز آزاد تدبر میں ہے لیکن اقبال ایسے مفکروں کا شعور تقلید کی بوجھل بیڑیاں پہنے ہوئے ہے اگر انسان مجبور محض معلوم ہوتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ اپنی داخلی قوتوں کی طرف سے نہ صرف غافل ہے بلکہ ان سے عملاً کام لینا نہیں جانتا۔ وہ اپنے محدود شعور کے ساتھ مشیت سے متصادم ہونے کی جسارت کرتا ہے اور جب اُس کے نتیجے میں اُسے زندگی کا دردسر ہاتھ آتا ہے تو درد و کرب سے چیخ اُٹھتا ہے۔

خدا کائنات اور انسان میں صرف انسان ایک گراں بہا قدرِ مشترک ہے۔

کیونکہ انسان کے بغیر خدا ہے نہ کائنات۔ مگر اس حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے فلسفہ وجود کا مطالعہ ضروری ہے۔ جس طرح جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں باہمی ربط و ضبط ہے اسی طرح خدا، انسان اور کائنات ایک ہی تصویر کے مختلف تین پہلو ہیں

حالانکہ یہ اختلاف انسان کامل کی عظیم ترین حقیقت سے بے خبری کے باعث ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کامل مرجاتا ہے تو کیا خدا بھی مرجاتا ہے اور کائنات بھی؟

جواب

انسان کامل کے بارے میں فلاسفروں یا مفکروں کا یہ کہنا کہ وہ مرتا ہے غلط اور بالکل بے معنی ہے کیونکہ انسان کامل کا ظہور زندگی اور موت کے جھمیلوں ہی سے نجات دلانے کے واسطے ہوتا ہے جو خود موت پر قابو پا چکا ہے البتہ ظاہری جسم اپنی معینہ معیار پوری کرنے کے بعد ضرور ظاہری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے انسان کامل اُسے خود چھوڑ دیتا ہے جب کہ زمین پر اس کا رول مکمل ہو جاتا ہے اُسے اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ جسم یا وجود تو یہ رول ادا کرنے کے سلسلے ہی میں وسیلے کا کام دیتا ہے جس کے ذریعے وہ کائنات انسانی سے رابطہ قائم کرتا ہے انسان کامل اپنا رول مختلف انداز میں سرانجام دیتا ہے موجودہ دور ذہنی ارتقا کا دور ہے جسمانی فوقیت کا لعدم ہو چکی ہے اب شہروں اور قصبوں کو روشن کرنے کے واسطے مشعلیں شمعیں دیئے اور چراغ درکار نہیں۔ بلکہ الیکٹرک پاور ہاؤس اسٹیشن کا سوچ آن کرنے کی وجہ ہوتی ہے کہ آن، واحد میں تمام شہر بقعہ نور بن جاتا ہے اب پا پیادہ مسافت کی ضرورت باقی رہی ہے نہ جانوروں پر بیٹھ کر ارضی زمان و مکاں کے فاصلے طے کئے جاتے ہیں بلکہ ہوائی جہاز کے ذریعہ کروڑوں میل کا سفر تھوڑے سے وقفے میں طے ہو جاتا ہے سینکڑوں میل دور اس طرح مبادلہ افکار و گفتار ہو سکتا ہے جیسے وہ شخص رُو برو ہو۔

بے تار برقی کے ذریعہ پیغام رسانی کے وسائل معجزانہ طور پر آسان ہو چکے ہیں "جام جمشید" کی اصطلاح تو ہم نے سنی تھی یا شعروں میں استعمال کی تھی۔ مگر ہماری اپنی زندگی میں ٹیلی ویژن کی ایجاد نے "جام جم" سے وابستہ روایات میں جان ڈال دی ہے

اب جبکہ ان انسانی اپنے نکتہ کمال پر پہنچ گیا ہے تو کیا اس زمانے میں اقبال کے روایتی "مرد مومن" کی ضرورت ہے جو کبھی شمشیر بکف ہو اور کبھی بے تیغ ہو کر آمادہ پیکار ہو۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

مگر اس زمانے میں "گھوڑوں" کی ضرورت کیا ہے؟ جبکہ کروڑوں گھوڑوں کی طاقت رکھنے والی الیکٹرک ایجاد ہو چکی ہے مگر ماضی کے اندھے کنوؤں میں محبوس لوگوں کو کون سمجھائے۔ کہ وہ دور ماضی کبھی نہیں آئے گا جس کے وہ سپنے دیکھ رہے ہیں مغرب نے نوع حیوانی کو اپنی خدمت سے سبکدوش کر دیا ہے کیونکہ اس کی بجائے وہ برقی مشینوں سے کام لیتا ہے اور بے زبان جانوروں پر بوجھ لاد کر اپنے لئے عذاب نہیں خریدتا۔ مگر مشرق کے بے شمار ممالک میں ابھی تک جو پایوں ہی سے محنت شاقہ لی جاتی ہے اور پھر ایسے دقیانوس لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں حالانکہ وہ یورپ یا مغرب یا امریکہ سے قرضے لے کر اپنی قیادت مسندوں کو سہارا دینے کی سعی نا کام کرتے ہیں اور پھر مغرب کو برا کہتے ہوئے بھی نہیں شرماتے گویا یہ لوگ "ہماری بلی اور ہمیں ہی میاؤں" کے مصداق جس کا کھاتے ہی اُس کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں۔

"وجودیوں میں اکثر خوف خصوصاً خوف مرگ میں مبتلا ہیں اور شاید یہی وہ ذہنی داخلی کیفیت اور احساس ہے جس کے اندر سے وجودی ایک داخلی زندگی کا وجدان حاصل کرتا ہے یہ صحیح ہے کہ خوف زندگی کی ایک اہم کیفیت ہے اور اسی سے انسان اور ہر ذی جہالت کی خود حفاظتی بیدار ہوتی ہے اور مقابلے کی آمادگی پیدا کرتی ہے لیکن احساسِ تنہائی اور خوف دونوں وہ بنیادی جبلتیں ہیں جن کی تسخیر کے لئے عقل اور ایمان جیسے عطیے خدا نے انسان کو دیئے ہیں"

ڈاکٹر موصوف گویا وجودیوں کو عقل اور ایمان سے خالی سمجھتا ہے یا بالالفاظ دیگر وہ عقل وایمان کو کوئی میکانکی شے سمجھتا ہے اور شاید خود اس صفت میں شامل ہو گیا ہے جہاں حزن و خوف نہیں۔ حالانکہ اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ جب وجودی تطہیر قلب کی ہم سر کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں غصہ لالچ اور شہوت کے محدود ترین خیالات سے اپنے وجود کو پاک کرنے کی اندرونی مہم شروع کرتے ہیں تو کوئی منزلوں کے بعد انہیں اس میں کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے کیونکہ بظاہر یہ لفظ "تطہیر قلب" آسان اور معمولی لگتا ہے لیکن اپنے

معانی کی وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے کس قدر غیر معمولی اور دشوار ہے اس کا اندازہ محض مذہبی ذہنیت رکھنے والے عقاید کا سہارا لینے والے اور تحقیق و تجسس سے بے خبر لوگ کہاں کر سکتے ہیں۔ جو مذہبی رسم و رواج کی باقاعدہ ادائیگی ہی کو ایمان سمجھے بیٹھے ہیں مگر تطہیر قلب علم ذات کے بغیر ایسا ہی ہے جیسے پیٹرول کے بغیر موٹر چلانے کی سعی کرنا یا ڈرائیونگ کے قاعدے اور فارمولے طوطے کی طرح رٹ لینے کو ڈرائیونگ سمجھ لینا۔ اس کے لئے وجودیہ نے عمر عزیز صرف کر دی۔ جب جا کر ان کا تحت الشعور صاف ہوا۔ صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارے مذہب میں رہبانیت نہیں نجات حقیقی فرض سے بھاگنا بہت آسان ہے مگر کیا انسانِ کامل کی معراج یا تکمیل کی زندگی رہبانیت کی آئینہ دار نہیں؟ سالہا سال غاروں کی تنہائیاں اس بات کا کافی ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ خود آگاہی اور تنہائی لازم ملزوم ہیں کیونکہ تنہائی کے بغیر انسان شعوری طور پر مکمل ہو سکتا ہے جو روحانی طور پر۔

تکمیل کے بعد انسان کامل عوام الناس کی ذہنی سطح کے مطابق سچائی کی زندگی بسر کرنے کے لئے فارمولے اور طریقے بتاتا ہے یہ ایسا ہے جیسا کہ ایک اُستاد جو شاگردوں کو فوری شعوری سطح سے بلند تر ہے ان کے سمجھانے کے واسطے انداز میں قاعدے فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے ان کی ذہنی تربیت مقصود ہوتی ہے لیکن شاگرد اُستاد کے بتائے ہوئے متبدیانہ قاعدوں کو ایک ناقابلِ تغیر دائرہ عمل بنالیں۔ تو ان کی عقل پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

انسانِ کامل جو ایک کامل ماہر نفسیات بھی ہوتا ہے ماحولی تقاضوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور علم النفسیات کے ترازو میں لوگوں کے ذہنوں کو تول تال کر اُن سے مخاطب ہوتا ہے مگر اُس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد لوگ اُس کی باتوں کو ہر زمان و مکان کے لئے لاکلام نسخہ شفا سمجھ لیتے ہیں بلکہ اس پر غیر ضروری منطقانہ علوم و فنون کا اضافہ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اس کے ظہور کی غرض و غایت ہی عنقا ہو جاتی ہے۔

اگر ڈاکٹر موصوف اقبال کے مردِ مومن کا معیار انہیں علوم و فنون کو قرار دیتا ہے تو وہ اقبال کی طرح خود بھی اس اُمید سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کہ ایسا لال بھکو مردِ مومن کا رول ادا

کرے گا۔ وہی خوف اور غم کی کیفیات جو بقول ڈاکٹر وجودیوں پر حاوی ہیں ڈاکٹر موصوف کونفسیاتی طور پران کیفیات کا تجربہ کرنا چاہیے۔

کیونکہ یہ کیفیات ہر ذی حیات میں موجود ہیں الغرض پرندے حیوان چوپائے درندے اور انسان برابر ان کیفیات کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں ہر کمزور نوع کو زیادہ طاقت ور نوع کا خوف دامنگیر ہے حتیٰ کہ چاروں عناصر کی مخلوقات کو خوف لاحق ہے ماتحت حاکم کے خوف سے لرزاں ہے اور ہر حاکم کے اُوپر ایک حاکم ہے اس لئے حکام بھی خوف زدہ ہیں اسی خوف نے بیگانگی اور غیرت کے ساتھ دفاعی ضروریات کا احساس پیدا کیا چنانچہ یہ دفاعی احساس ہر ذی جاں میں موجود ہے۔

اسی احساس نے ملکوں کوملکوں کے خلاف اور قوموں کو قوموں کے مقابلے پر اکسار کھا ہے اور انسانی معاشرے میں غیر ضروری طور پر کئی ایسے شعبے ایجاد کئے ہیں جن کی وجہ سے کرۂ ارضی پر کسی نہ کسی پیمانے کی خونریزی جنگیں رونما ہوتی رہتی ہیں اور اسی احساس کی بدولت ذہنِ انسانی منفی انداز میں ہولناک آلات جنگ ایجاد کررہا ہے اسلحہ سازی کی دوڑ میں ہر ملک دوسرے ملک سے گوئے سبقت لے جانا چاہتا ہے یہی وہ احساسِ خوف ہے جو بزدلی کو جنم دیتا ہے تو دوسری طرف درندگی' وحشت' بربریت اور قتل وغارت کے مہلک ترین جراثیم بھی پیدا کرتا ہے کیونکہ اگر بزدلی بہادری اور شجاعت کی کمتر صفت ہے تو دلیری اور شجاعت بھی بزدلی ہی کی معیاری صفت ہے حقیقتاً جنگ و جہاد میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں میں انسانی ہلاکتیں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ اور دونوں کی بنیاد خونریزی پر ہے اگر جنگ کو جہاد کا نام دینے والے کہتے ہیں کہ ہم بدی کے خلاف اور نیکی کے لئے خون بہارہے ہیں تو براہ راست جنگ کو جنگ کہنے والوں کے پاس بھی یہی وجہ جواز موجود ہے کیونکہ جنگ اور جہاد محض ڈپلومیسی کے نام ہیں اگر انسان کے پاس سانپ کا سر کچلنے کے لئے وجہ جواز موجود ہے تو سانپ کے پاس بھی اُسے ڈس لینے کے دلائل موجود ہیں کیونکہ دونوں اپنے اپنے دفاع کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ انسان کا سانپ کو مار ڈالنا اُس کے خوف کی بیّن شہادت ہے اور سانپ کے اُسے ڈس کر ہلاک کرنے کی تہ میں بھی اُس کا خوف ہی کا

رفرما ہے شجاعت خوف کی ایک ارتقائی کیفیت ہے اور اس میں بھی ہر وقت حریف کا خوف شامل رہتا ہے انسانی تمدن میں جو غیر ضروری شعبے ایجاد ہوئے ہیں وہ ملٹری اور پولیس کے شعبے ہیں جن کی تشکیل و تربیت کی تہ میں یہی خوف کا عنصر شامل ہے چنانچہ معاشرہ دفاعی اخراجات کے بوجھ تلے دب گیا ہے اور ہمیشہ دبا رہا ہے جس کے نتیجے میں عوام الناس کی جہالت ترقی پر ہے اور دوسری طرف اسے تعمیر و تخلیق سے دور رکھا گیا ہے اسی خوف نے جاگیرداری' قبائلی عصبیت اور سرمایہ پرستی کے مہلک جراثیم پیدا کئے اور معاشرہ انسانی کو توازن سے محروم رکھا۔

خوف کی علت نمائی انسان کی اس ابتدائی اور ماقبل از زمانہ تاریخ کی زندگی ہے جب وہ درندوں اور وحشی جانوروں کے درمیان انہیں کی مانند رہتا ہے تھا اگرچہ اس وقت اس کی ضروریات زندگی سرے ہی سے نہ تھیں کیونکہ بھوک کے وقت اسے غذا حاصل کر لینے کے سوا اس میں اور کوئی شعور نہ تھا اور غذا کا حصول بھی اس زمانے میں کوئی آسان بات نہ تھی اسے سخت تگ و دو کرنا پڑتی تھی اس جدوجہد میں بعض اوقات اسے زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنا پڑتے تھے وحشی جانوروں اور درندوں کے خوف سے زیادہ اسے اپنے ہم جنسوں کی طرف سے بھی فراغت حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ بھوک محسوس ہونے پر وہ ہم جنسوں کو ہلاک کرکے اس کا کچا گوشت چٹ کر جاتا تھا اس کی اس غیر متمدن زندگی میں خوف ہی کا عنصر غالب تھا یہی نہیں بلکہ طوفان برق و باد و باراں کے خوف کے علاوہ طرح طرح کی آفات و بلیات ارضی و سماوی کا خوف بھی اس پر مسلط رہا ہے اس کے علاوہ بیماری اور موت کا خوف بھی اسے قدم قدم پر لاحق رہا ہے چنانچہ ان گنت زمانوں سے اس طرح خوف اور دہشت کی زندگی گذارنے کے سبب اس کی اولاد میں یہ موروثی طور پر نسلاً بہ نسلاً اور نطفہ در نطفہ منتقل ہوتا رہتا ہے یہ خوف اپنی جڑیں اتنی مضبوط کر چکا ہے کہ بڑی عرق ریزی اور مسلسل جدوجہد کی ایک خاص زندگی ہی اس سے نجات حاصل کر سکتی ہے اگرچہ دانایان روزگار کی تعلیم انسان کو خوف کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد کر دیتی ہے مگر محض کسی مرض کی علامات دور کرنے سے مرض دور نہیں ہوتا کیونکہ جب تک اس کی جڑیں موجود ہیں یہ کسی وقت بھی

اپنے برگ بار کے ساتھ ظاہر ہو سکتی ہے
عرفانِ ذات کے بغیر خوف و غم دور نہیں ہو سکتے وجودی سے مراد غالباً وہ لوگ ہیں جو اپنے وجود کی چار دیواری میں مقید ہیں ورنہ کائنات کو وحدت الوجود سمجھنے والے عارفانِ حق کو کیا خوف ہے؟

ایمان پیدا کرنے کے لئے محض خوش عقیدہ ہونا کافی نہیں۔ بلکہ ایمان کامل حاصل کرنے کا طریقہ روحانی علم و دانش میں پوشیدہ ہے جو علم ذات پر مبنی ہے اور علم ذات کا حصول نہیں اذہان کے لئے مشکل نہیں جو مفروضہ عقائد وغیرہ کی سخت گیر زنجیروں میں جکڑے ہوئے نہیں ہوتے کیونکہ عرفانِ ذات تمام قسم کے بند و سلاسل سے نجات دیتا ہے
ڈاکٹر صاحب ایسے اسکالروں کو یہ قطعی علم نہیں ہو سکتا کہ توحید تین طرح کی ہے

۱۔ توحید وجودی

۲۔ توحید شہودی

۳۔ توحید تنزیہی

اور توحید کے شعور کی تکمیل اکثر تینوں اقسام پر محیط ہے کسی مضمون کا پی ایچ ڈی یا اسکالر ہو جانا اس امر کی دلیل نہیں۔ کہ توحید یا علم ذات اور عرفان ذات ایسے نازک ترین مسائل پر بھی دسترس حاصل ہو۔ کیونکہ عرفانِ ذات کے سوا باقی تمام علوم فروعی ہیں۔ اور فروعی علوم و فنون کا تعلق محسوسات سے ہے مگر عرفان ذات محسوسات سے وراء الوراء ہے حتی کہ الفاظ و صورت تصور و خیال ادراک وجدان کی سرحدوں سے بھی پرے پرے ہے۔ اور اس کے لئے کسی یونیورسٹی کی سند یا ڈپلومے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کیونکہ ذہن انسانی تو ایک چراغ کی مانند ہے نہاں خانہ وجود کی تاریکی سے باہر نکلنے کے لئے اس کی روشنی درکار ہے۔ مگر ظلمستانِ وجود سے باہر تو آفتاب حقیقت المعرافشاں ہے۔

یہ علوم و فنون جو ہمارے اسکالروں کو حاصل ہیں۔ تحصیل علم ذات کے راستے میں حجاب اکبری تو ہیں اور عظیم رکاوٹ۔

☆☆☆

توحید اور اشتراکیت

ہے ادھورا اب بھی انساںؔ کا شعوری ارتقاء
نا مکمل ہے ابھی تخلیق یزداں دیکھئے
(صائب عاصمی)

انسان کامل کا ظہور ارضی زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے اس لئے وہ کبھی توحید وجودی کا اور کبھی توحید شہودی کا آئینہ دار ہوتا ہے توحید تنزیہی قدرتا اُس زمانے میں درکار ہوتی ہے جب جہالتی علوم فنون کو علم اور بے ایمانی کو ایمان سمجھ لیا جاتا ہے یعنی نوح کی توحید توحید تنزیہی ہی تھی۔ توحید تنزیہی لوگوں کی اس قسم کی ذہنیت کے مطابق قہاری اور جلالی ہی کی مظہر ہوتی ہے۔

یہ غلط ہے کہ وجودی جو وحدت الوجود کے ترجمان ہیں توحید کے رجحان نہیں ہوتے کیونکہ فلسفہ وحدت الوجود میں توحید شہودی بھی شامل ہے اور توحید تنزیہی بھی اور یہ بھی غلط ہے کہ کامل ہستیوں پر خوف وملال غالب رہتا ہے غصہ غم اور خوف ابتدائی منازل ومقامات کی کیفیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ذاتی طور پر خوف زدہ اور پُر ملال رہتے ہیں اور ہمیشہ ان کیفیات سے عہدہ برآ رہے ہیں چونکہ کائنات کے ذرے ذرے نیز ہزوی حیات میں یہ کیفایت موجود ہیں اور سالکین کمل کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض اوقات شعوری طور پر اور اکثر غیر شعوری طور پر بھی ان کے لطیف ترین آئینہ دل پر یہ خارجی اور بظاہر داخلی کیفیت منعکس ہوتی ہیں اور چھٹی منزل طے کرنے کے بعد انہیں ان سے قطعی نجات مل جاتی ہے۔

دوش وقتِ سحرا ز غصہ نجاتم دادند
واندراں ظلمت شب آبِ حیاتم دادند
(حافظ)

کیونکہ سلوک کی سات منازل ہیں چھ منزلیں ظلمت کدہ ذہن سے تعلق رکھتی ہیں عبوری سفر کے دوران میں سالک وجود کی تمام ترکیفیات سے عہد برآ رہتا ہے وہ چھٹی منزل طے کرنے کے بعد اقلیم روح میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہاں پہنچ کر مسافر (سالک) ارضی زمان ومکان کے تقاضوں کو لا محدودیت کی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ وہ کماحقہ باخبر ہوتا ہے وہ تصورات ونظریات کی محدودیتوں سے ماورا ہو کر عمل کا پیغام دیتا ہے جس کی تہہ میں آفاقیت ہوتی ہے اور اس کی یہ آفاقیت ہی مذہب' قومیت اور وطنیت کے تخیل سے پاک ہوتی ہے وہ کسی ذاتی مصلحت یا منفعت کو پیش نظر رکھنے کی بجائے مصلحت کل کا داعی ہو جاتا ہے اگر وہ اس مقام پر فائز ہونے سے پہلے ایک فطری فن کار تھا تو اُس کا فن کل کیلئے ہوتا ہے بلکہ فنون لطیفہ کی افادیت کسی نوع کی محدودیت کھو کر تناہیت سے ہمکنار ہو جاتی ہے اُس کے افکار سب کے لئے یکساں دلچسپی کا سرمایہ ہوتے ہیں وہ فطرتاً اُن تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے جن میں ہمہ گیری گہرائی کے علاوہ اثر آفرینی ہوتی ہے کیونکہ وہ زندانِ ذہن کی تمام فصیلوں اور حدوں کو توڑ تاڑ کر مقدس اتحاد کا ظہور مجسم ہو جاتا ہے اس لئے لامحالہ وہ انہیں نظریات کا مؤید ہوتا ہے جو اتحاد کے ترجمان ہیں کیونکہ اُس کا اپنے اتحاد پر کامل ایمان ہوتا ہے یہ اتحاد ہی حق ہے جو توحید کا عملی اظہار ہے۔

اس دورِ نو میں کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت زندہ روحانیت کی عملی تعبیر ہے۔ جو نوعِ انسانی کو ایک آفاقی' تخلیقی اور تعمیری معاشرے کی طرف لے جا رہا ہے چونکہ بنیادی طور پر ہر شخص مساوات انسانی کا قائل ہے اس لئے یہ نظریہ سب کے لئے کشش رکھتا ہے اگر چہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کے لئے لاکھ صدماں رساں ہو۔ اور وہ اس کی مخالفت کے جواز میں اپنی ذہنیت کے مطابق دلائل پیش کرتے ہوں مگر حقیقت میں ان کے پاس کوئی ٹھوس اور زندہ دلیل نہیں۔ کیونکہ اس وقت عملاً اربوں لوگ اس نظریئے کو اپنا چکے ہیں۔ اور بذاتِ خود یہ ایک جاندار اور زندہ نظریہ اور دلیل قاطع ہے۔

جنت الحمقاء کے باشندے جن نظریات پر انحصار رکھتے ہیں انہیں صدیوں تک پیرائے

عمل عطا نہ کر سکے۔ اور اب جبکہ وقت گذر چکا ہے اور ماضی مر چکا ہے ابھی تک ان کو حرف آخر سمجھے بیٹھے ہیں۔ اشترا کی طرز تمدن اس وقت پوری آب وتاب کے ساتھ تخلیق پذیر رہا ہے مشرقی یورپ کے علاوہ چین اور روس میں اشترا کی طرز حکومت کے ساتھ ساتھ اشترا کی معاشرت ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے علاوہ ازیں دنیا کے پانچوں براعظموں کے باشعور لوگ اس حامی اور موید ہیں۔

اشترا کیت کی مخالفت میں وہ لوگ جنہیں مفکر کہا جاتا ہے یہ دلیل بصد و مد کے ساتھ دیتے ہیں کہ یہ نظام معاشرت روح کی تسکین نہیں کرتا حالانکہ ان لوگوں کو خود سکون اور تسکین حاصل نہیں۔ کیونکہ جسمانی تشفی کے بغیر روح کی تسکین کے خواب دیکھنا ایسا ہی ہے کیونکہ جسم روح سے الگ ہے نہ روح جسم سے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ "ابلہ" قسم کے لوگوں نے رسم و رواج کی پابندی کو رُوحانی تشفی کا ذریعہ مان رکھا ہے حالانکہ جو رُوح لازمان و لامکان ہے جو کسی قسم کی پابندی کی متحمل نہیں۔ وہ جسمانی قیود کیونکہ برداشت کرسکتی ہے کیونکہ جسم کا تعلق ارضی زمان ومکان اور ماحولی نفسیات سے ہے اسے مناسب ضروریات زندگی مہیا نہ ہوں۔ تو روح پر اثر پڑتا ہے چنانچہ جسم مُرجھا جائے تو روح بھی مردہ ہو جاتی ہے۔ جسم کی جسمانی غذا ت مکار ہے ہر فرد کا جسم کل نوع انسانی کا جسم ہے اور ہر فرد کی روح کل کی روح ہے اس لئے جسمانی تقاضے یونیورسل سکیل کے حامل ہونا ضروری ہیں۔ قدرت کی ہر شے مساویانہ طور پر موجود ہے آگ' پانی' ہوا اور مٹی میں کوئی حد نہیں۔ چاند سورج اور ستارے بھی غیر محدود ہیں ایک فرد کی محنت خواہ اس کا تعلق جسمانی ذہنی یا روحانی محنت سے ہو۔ سب کے لئے یکساں اور مفید ہے درحقیقت جسم ذہن اور روح کی تفریق بھی بے معنی ہے کیونکہ مادہ اور روح ایک ہی ہے۔

اس نکتہ نگاہ سے اشترا کیت اس دور کا بلکہ مستقبل کا بھی بہترین علاج ہے اشترا کیت (COMMUNISM) کا انسان سے تعلق ہے۔ کیونکہ انسان کے بغیر کائنات، ایک ایسا خزانہ ہے جسے استعمال کرنے والا کوئی نہ ہو۔ خدا ایک مفروضہ یا موہومہ ہے اور اگر خدا

ہے تو انسان سے باہر نہیں۔ بالا الفاظ دیگر خدا انسان کا محتاج ہے کیونکہ انسان کے بغیر اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ فی الواقع خدا انسان کی ایک لامحدود فطری قوت ہے بشرطیکہ وہ اسے عملاً اپنے میں جلوہ گر کردے عظمتِ انسانی کے اس نہایت اُونچے معیار کا کسی طرح کی اجارہ داری یا شخصیت پرستی سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ جن افراد نے اس معیار کو اپنایا ہے انہوں نے بالا تفاق انسان دوستی اور انسانی برادری کا یکساں راز معلوم کیا ہے اور سب کے دکھ درد کو یکساں محسوس کیا ہے چنانچہ کارل مارکس سے پہلے بھی اشتراکیت ہی کی قسم کے نظریات وقتاً فوقتاً معرض ظہور میں آتے رہے ہیں لیکن ان میں سے بہت کم جاندار ثابت ہوئے کیونکہ ایسے نظریات کی تخلیق کے لئے بے غرضی، ایمانداری اور ایثار کی ضرورت ہے۔

کُل دنیا کے انسانوں کا دُکھ اپنا کر اس کے علاج کے واسطے مشترکہ میدان عمل میں گامزن ہونا کوئی بازیچہ طفلاں نہیں۔ بلاشبہ کارل مارکس اِس دور کا ایک عظیم ترین مفکر ہے جس نے ایک عالمگیر انسانی معاشرے کی تخلیق کے لئے یہ نظریہ وضع کیا۔ جو اس وقت کئی کروڑ انسانوں کی زندگی بن چکا ہے چنانچہ دنیا میں ہر جگہ کسی کی ضرورت ہے جو انسان کو ہر طرح کی اجارہ داریوں سے نجات دلائیں۔ اور ماضی پرستانہ ذہنیت کا استحصال کرنے کے لئے ایسے ہی انقلابات برپا کریں جو تقریباً نصف صدی پہلے روس میں رونما ہو چکے ہیں اس کے بعد چین میں بھی جہاں اَسّی کروڑ عوام نے ماضی کے جزام زدہ ناسوروں سے نجات پائی ہے۔

مستقبل قریب میں کُل دنیا اشتراکیت کی گود میں رہ کی فطری نعمتوں سے مالا مال دکھائی دے گی۔ مذاہب کا بے جان لاشہ جو اپنے گلے سڑے اعضاء کے ساتھ تبرکاً ابھی تک رکھا گیا ہے جس کی سڑاندھ سے معاشرے کا دم گھٹ رہا ہے ہمیشہ کے لئے زمین میں دبا دیا جائے گا۔

عرفان ذات کا بول بالا ہوگا کیونکہ عرفانِ ذات کا مفہوم عرفان نفس کے بغیر نامکمل ہے ایک انسان کامل کہتا ہے وہ دن دور نہیں جب مذہب ختم ہو جائے گا اور خدا آ جائے گا کیونکہ اب "خدا" نہیں اور مذہب ہے اس کی ذہنی تعبیریں ہو سکتی ہے وہ دن دور نہیں جب "خدا" کو زمین آسمان سے نکال دیا جائے گا اور انسانیت ظہور پذیر ہو جائے گی۔ مذہبی دنیا

کا خدا وہ ہے جو اُونچ نیچ' جات پات رنگ و نسل اور ملک و قوم وغیرہ کے غیر فطری امتیازات کا خالق ہے کیونکہ دیندار اور خدا پرست معاشرے ہی میں موجود ہیں کیا ہم اس سے یہ اندازہ نہ کر لیں کہ اُس خدا کی یہی مرضی ہے جبکہ اسی کے اذن کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرتا اور پتہ تک نہیں ہلتا۔

یہ مضحکہ خیز بات ہے کہ مذہبی دنیا اپنی بے عملی کے جواز میں عجیب وغیرب جواز پیش کرتی ہے۔ اور اکثر حوالے دیتی ہے کہ ہمارے خدا نے "یہ کہا ہے اور یوں کہا ہے" مگر اس کا عمل جو گواہی دیتا ہے کسی باشعور انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ کیونکہ عمل ہی کسی نظریے کی زندہ دلیل ہے دراصل ہمیں اپنے محاذ پر کامل ایمان ہے اور مذہبی دنیا کی خدا پرستی متزلزل ہے اور شک و تشکیک میں مبتلا۔

چونکہ کامل رُوحانی دانش بھی الحاد پر منتج ہوتی ہے اور اشتراکیت کے تعمیر و تخلیقی اصول بھی ملحدانہ بنیادوں پر ہیں۔ اس لئے اشتراکیت کے سوا اور کوئی طریق کار نہیں۔ جو ہمارے اصولوں کا فطرتاً ساتھ دے۔ کیونکہ روحانی کمالِ دانش کا لحاد" ایک آفاق گیر انکشاف" ہے۔

اگر ابھی تک منصور کی طرح اعلانِ حق کرنے والے سور و عتاب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک جہالت معاشرتی شعبوں پر مسلط ہے اگر ابھی تک بلند و برتر شعور کی تجلیات ظاہر ہونے پر قدغن ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک انسان عالمِ طفولیت ہی میں ہے ویسے اُن ممالک کو چھوڑ کر جہاں پوری سرمایہ دارانہ معاشرہ بھی ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اور اَن گنت صدیوں سے بڑھا کھوسٹ جاگیردارانہ نظام مسلط ہے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں کمیونسٹ سوسائٹی کے خدوخال اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں یوں تو جاگیرداری اور سرمایہ داری دونوں ہی معاشرت کے لئے طاعون اور جزام کی حیثیت رکھتے ہیں مگر جاگیرداری قدیم زمانے کی پیداوار ہے اور سرمایہ داری موجودہ دور کی تخلیق۔

☆☆☆

اقتصادی مساوات

(منشورِ فطرت)

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

(اقبال)

دنیا میں لاکھ اوتار آئیں یا کروڑ پیغمبر اور رسول پیدا ہوں مگر جب تک نوعِ انسانی کو اقتصادی مساوات نصیب نہیں ہوتی۔ اُس وقت تک معاشرۂ انسانی میں عملی صداقتوں کا وجود دکھائی نہیں دے سکتا کیونکہ زمین پر رہ کر زمین پر بسنے والی نسلِ انسانی کے تمام روگوں کا علاج اقتصادی مساوات ہے کیونکہ یہ انتہائی نازک اور توجہ طلب مسئلہ اس سائنسی دور میں بدستور عمل طلب ہے جبکہ سائنس نے زماں و مکاں کی حدیں توڑ کر ارضی مساوات کا عملی مجموعہ پیش کر دیا ہے۔ جب عناصرِ فطرت سب کے لئے یکساں ہیں جب آسمان اور زمین لامحدود فضا ہیں۔ جب ہوا کسی کے لئے محدود نہیں ہوتا جب چاند سورج ستارے یکساں فائدہ مند ہیں تو یہ مسئلہ کیوں حل نہیں ہوتا؟ انسان کیوں دولت اور سرمائے پر ناجائز طور پر متصرف ہو جاتا ہے اور جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اس کے ان گنت ہم جنس ضرورت مند اور مفلس ہیں؟ کیا مذہب نے کسی عملی طور پر ان بیماریوں کا علاج کیا ہے جو انسانیت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں؟ ہاں یہ افلاس اور غریبی کی مہلک ترین بیماریاں۔ کیا اقتصادی مساوات کے نہ ہوتے ہوئے مذہبی تقدس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے فقدان کے پیشِ نظر کوئی نیکی بھی سرانجام پا سکتی ہے؟ کیا مذہب آج تک تعصبات کا منافرت' حسد' لالچ غصہ اور جھوٹ کا سدِ باب کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے؟ کیا مذہب کے دعویداران اوصافِ ذمیمہ سے مبرا ہیں کیا معاشرت اُونچ نیچ اقتصادی مساوات کے فقدان کا نتیجہ

نہیں۔ کیا جرائم اور گناہ اقتصادی مساوات کے نہ ہونے سے جنم نہیں لیتے ؟ کیا اقتصادی مساوات کے بغیر تھانے جیل، درسگاہیں یونیورسٹیاں اور تہذیب وثقافت اور لٹریچر کے ادارے بے معنی اور تمسخر نہیں بلکہ اُلٹا جرائم کی تربیت گاہوں کی حیثیت نہیں رکھتے۔ کیا اقتصادی مساوات کے بغیر صداقت شعاری' راست بازی' دیانت' اخلاق اور ایمانداری کا تصور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

اس مذہبیت سے وہ دہریت کروڑ درجے اچھی ہے جو منافقت اور ریاکار کے جراثیم کی پرورش کے سامان تو نہیں کرتی۔ جو اقتصادی مساوات کے نتیجے میں اُخوت انسان کا رول ادا کرتی ہے۔ چنانچہ انصاف سے دیکھا جائے تو ان ممالک میں جرائم تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جس میں کمیونزم نافذ العمل ہے۔ لیکن اگر ان سرمایہ پرست ممالک کا موازنہ ان سے کیا جائے۔ تو اُن کی مذہبی سرپرستیوں کے ڈھول کا پول ہو جاتا ہے اور اُن کے تہذیب و تمدن کی قلعی کھل جاتی ہے۔ مذہبی دُنیا کی لاتعداد اور خوفناک سیاہ کاریوں کی تاریخ انتہائی دلخراش اور اندوہناک ہے کیا سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کے ہوتے ہوئے کسی قسم کے جمہوری نظام کا خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کیا ایسے جمہوری نظام میں مساوات موجود ہے؟

کیا ایسے ممالک کی صحافت، ثقافت ادب، قیادت، تجارت، سیاست معاشرت اور وکالت فریب کاریوں کی ایک طویل طالانی داستان نہیں؟ کیا یہاں ایمان کے نام پر بے ایمانی ذہانیت کے نام پر بددیانتی انصاف کے نام پر۔ بے انصافی، صداقت کے نام پر دروغ گوئی اور جمہوریت کے نام پر بدترین قسم کی شخصی آمریت، علم کے نام پر جہالتیں اور خدا کے نام پر مکاری بول بالا نہیں ہوتا۔

کیونکہ جہاں انسان کے پیٹ کی بھوک مٹنے کا کوئی نظام نہیں۔ وہاں دیگر ہر طرح کی بھوک بھی ہوتی ہے۔ اور یہ بھوک ہی لاتعداد مختلف جرائم کو جنم دیتی ہے چنانچہ اس قسم کے معاشرے میں نیکی کی باتیں محض بکواس کا درجہ رکھتی ہیں اور اخلاق فقط خرافات ہوتا ہے کیونکہ ایسی سوسائٹی میں نیکی اور اخلاق کے رنگی مظاہروں کے پس پردہ بھی منافقتیں، جھوٹ اور ریاکاریاں ہی کارفرما ہوتی ہیں اگر اقتصادی مساوات کا قانونِ فطرت نافذ العمل ہونے کی راہ

میں انسان کے جذبات حیوانی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں یہ نظام محض کتابوں اور کاغذوں میں محفوظ رکھنے کی غرض سے وضع نہیں کیا جاتا یا محض جماعتی دستوروں میں اس کا ضمنی تذکرہ کافی نہیں۔ بلکہ اس کے نفاذ کے لئے ایسے نظام حکومت کی ضرورت ہے۔ جس کے اجزائے ترکیبی اپنے ذاتی مشاہدے سے علم ذات سے باخبر ہوں جنہوں نے علمی صداقت کا سراغ لگا لیا ہو۔ اور ان کا شعوری ارتقا منزل مقصود سے ہمکنار ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر اقتصادی مساوات کا نفاذ قطعی طور پر ممکن نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس نظام حکومت کے اجزائے ترکیبی لالچ' حسد' کینہ' غصہ' بغض اور دیگر اوصاف حیوانیت سے مبرا ہوں گے اور انہوں نے عملی مشاہدے اور تجربے کے ساتھ اس حقیقت کو پا لیا ہوگا کہ کل نوع انسانی ایک ہے جو لا محدود اکائی (limitless Unit) کی حیثیت رکھتی ہے تمام اجسام ایک ہی جسم ہے تمام اذہان ایک ہی ذہن ہے تمام آنکھیں ایک ہی آنکھ ہے تمام ہاتھ ایک ہی ہاتھ ہے اور تمام قلوب ایک ہی قلب ہے کیونکہ ایک ہی خیال اور ایک ہی روح ہے جو کل کائنات میں ہے حتیٰ کہ مادہ اور روح کا فرق و امتیاز بھی مٹ جاتا ہے تصوف کی قدیم اصطلاح میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ "وحدت انسانی ہی وحدت الوجود کی حقیقی معنویت کا مکمل اظہار ہے یا شعوری ارتقا کی تکمیل مجاز و حقیقت کا امتیاز بھی ختم کر دیتی ہے یہ مجاز ہی عام اصطلاح میں مادّہ اور حقیقت و روح ہے۔

مشاہدے اور تصدیق کے مراحل سے گذرتے ہوئے اس علم کی رو سے کل افراد انسانی فی الواقع ملت واحدہ ہیں خواہ وہ ارضی خطے کے کسی گوشے میں رہتے ہوں۔ خواہ جغرافیائی حدود کے اعتبار سے وہ کسی بھی رنگ و نسل سے ہوں خواہ ان کی زبانیں کتنی ہی مختلف ہوں۔ یہ یونیورسل (آفاقی) انسان کا کنبہ ایک ہے وہ اپنی بنیادی اور فطری ضروریات کے لحاظ سے یکساں توجہ کے مستحق ہیں سب کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان ہیں خواہ جغرافیائی محل وقوع اور علاقائی آب و ہوا کے اختلاف کی رو سے ان بنیادی ضروریات کا معیار کیسا ہی ہو مگر یہ مسلمہ بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک عالمگیر اقتصادی اور معاشی مساوات کے منشور کے تحت رہنے سہنے اور کھانے پینے کی ضرورت ہے

ظاہر ہے کہ اگر اقتصادی اور معاشی وسائل علم ذات سے قطعی نابلد یا بالفاظ دیگر حیوانات ناطق کے ہاتھ میں آ جائیں تو اقتصادی اور معاشی مساوات کے قانون فطرت کی نہ صرف خلاف ورزی ہے بلکہ خلاف فطرت رخنہ اندازی بھی ہے کیونکہ اس خلاف فطرت نظام حکومت کے باغی اجزائے ترکیبی اپنے ان گنت ہم جنسوں کے فطری حقوق غصب کر لیں گے نتیجتاً مٹھی بھر لوگ اقتدار کی مسندوں پر متمکن ہو کر سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی یا جاگیرداری کی بنیاد رکھیں گے معاشرہ انسانی غیر منصفانہ تقسیم کار غیر منصفانہ تقسیم زمین اور غیر منصفانہ تقسیم زن کے غیر فطری اُصولوں کا ترجمان بن جائے گا کیونکہ افلاس غریبی اور بیماری کے علاوہ ہر طرح کے جرائم کی پرورش ہوگی اقتصادی عدم مساوات کے مہلک اثرات معاشرے کے تمام شعبوں میں سرایت کر جائیں گے کیونکہ منفعت اندوزی زراندوزی چور بازاری اور دیگر قسم کا استحصال پورے معاشرہ انسانی کو روگی اور بیمار بنا کر رکھ دے گا سرمایہ پرستی کے زیر سایہ جو ادب' تہذیب' ثقافت، صحافت اور معاشرت پیدا ہوں گے وہ سرمایہ داری ہی کی تقویت کا باعث ہوں گے کیونکہ اقتصادی و معاشی مساوات ایک بہترین اور مجوزہ نظامِ حکومت کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر شعوری انقلاب لانے کی ضرورت ہے مگر اس نوع کے انقلاب کا علم اُن عناصر کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جو مثبت اقدار حیات کے حامل اور علم ذات سے عملاً بہرہ اندوز ہوں کیونکہ آخر کار انہیں کو ہی نظام حکومت بھی چلانا ہوگا۔

جس طرح دورانِ خون رُک جانے سے جسم کا کوئی حصہ بے کار یا متورم ہو جاتا ہے اور اس بات کا اثر پورے اعضائے جسمانی پر پڑنا ناگزیر ہے کیونکہ پورا جسم بیمار اور دکھی ہو جاتا ہے اسی طرح معاشرہ انسانی جو ایک عالمگیر اکائی جسم ہے جو مٹھی بھر افراد کے زراندوز اور سرمایہ پرست ہو جانے سے بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان گنت انسان ابتدائی اور بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں چند کنبے سرمائے اور دولت کے وسائل پر قابض ہو کر اپنے کروڑوں ہم جنسوں سے ڈھور ڈنگروں کی طرح سلوک کرتے ہیں اور دولت کے بل بوتے پر ان کے دماغوں' ذہنوں' خیالوں' جسموں پر متصرف ہو جاتے

میں انسان کے جذبات حیوانی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں یہ نظام محض کتابوں اور کاغذوں میں محفوظ رکھنے کی غرض سے وضع نہیں کیا جاتا یا محض جماعتی دستوروں میں اس کا ضمنی تذکرہ کافی نہیں۔ بلکہ اس کے نفاذ کے لئے ایسے نظام حکومت کی ضرورت ہے۔ جس کے اجزائے ترکیبی اپنے ذاتی مشاہدے سے علم ذات سے باخبر ہوں جنہوں نے علمی صداقت کا سراغ لگا لیا ہو۔ اور ان کا شعوری ارتقا منزل مقصود سے ہمکنار ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر اقتصادی مساوات کا نفاذ قطعی طور پر ممکن نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس نظام حکومت کے اجزائے ترکیبی لالچ' حسد' کینہ' غصہ' بغض اور دیگر اوصاف حیوانیت سے مبرا ہوں گے اور انہوں نے عملی مشاہدے اور تجربے کے ساتھ اس حقیقت کو پالیا ہوگا کہ کل نوع انسانی ایک ہے جو لامحدود اکائی (limitless Unit) کی حیثیت رکھتی ہے تمام اجسام ایک ہی جسم ہے تمام اذہان ایک ہی ذہن ہے تمام آنکھیں ایک ہی آنکھ ہے تمام ہاتھ ایک ہی ہاتھ ہے اور تمام قلوب ایک ہی قلب ہے کیونکہ ایک ہی خیال اور ایک ہی روح ہے جو کل کائنات میں ہے حتیٰ کہ مادہ اور روح کا فرق و امتیاز بھی مٹ جاتا ہے تصوف کی قدیم اصطلاح میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ "وحدت انسانی ہی وحدت الوجود کی حقیقی معنویت کا مکمل اظہار ہے یا شعوری ارتقا کی تکمیل مجاز و حقیقت کا امتیاز بھی ختم کر دیتی ہے یہ مجازی عام اصطلاح میں مادّہ اور حقیقت و روح ہے۔

مشاہدے اور تصدیق کے مراحل سے گذرتے ہوئے اس علم کی رو سے کل افراد انسانی فی الواقع ملتِ واحدہ ہیں خواہ وہ ارضی خطے کے کسی گوشے میں رہتے ہوں۔ خواہ جغرافیائی حدود کے اعتبار سے وہ کسی بھی رنگ و نسل سے ہوں خواہ ان کی زبانیں کتنی ہی مختلف ہوں ۔ یہ یونیورسل (آفاقی) انسان کا کنبہ ایک ہے وہ اپنی بنیادی اور فطری ضروریات کے لحاظ سے یکساں توجہ کے مستحق ہیں سب کی بنیادی ضروریات روٹی ، کپڑا اور مکان ہیں خواہ جغرافیائی محل وقوع اور علاقائی آب و ہوا کے اختلاف کی رو سے ان بنیادی ضروریات کا معیار کیسا ہی ہو مگر یہ مسلمہ بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک عالمگیر اقتصادی اور معاشی مساوات کے منشور کے تحت رہنے سہنے اور کھانے پینے کی ضرورت ہے

ظاہر ہے کہ اگر اقتصادی اور معاشی وسائل علم ذات سے قطعی نابلد یا بالفاظ دیگر حیوانات ناطق کے ہاتھ میں آ جائیں تو اقتصادی اور معاشی مساوات کے قانون فطرت کی نہ صرف خلاف ورزی ہے بلکہ خلاف فطرت رخنہ اندازی بھی ہے کیونکہ اس خلاف فطرت نظام حکومت کے باغی اجزائے ترکیبی اپنے ان گنت ہم جنسوں کے فطری حقوق غصب کر لیں گے نتیجتاً مٹھی بھر لوگ اقتدار کی مسندوں پر متمکن ہو کر سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی یا جاگیرداری کی بنیاد رکھیں گے معاشرہ انسانی غیر منصفانہ تقسیم کار غیر منصفانہ تقسیم زمین اور غیر منصفانہ تقسیم زر کے غیر فطری اصولوں کا ترجمان بن جائے گا کیونکہ افلاس غریبی اور بیماری کے علاوہ ہر طرح کے جرائم کی پرورش ہوگی اقتصادی عدم مساوات کے مہلک اثرات معاشرے کے تمام شعبوں میں سرایت کر جائیں گے کیونکہ منفعت اندوزی زراندوزی چور بازاری اور دیگر قسم کا استحصال پورے معاشرہ انسانی کو روگی اور بیمار بنا کر رکھ دے گا سرمایہ پرستی کے زیر سایہ جو ادب' تہذیب' ثقافت، صحافت اور معاشرت پیدا ہوں گے وہ سرمایہ داری ہی کی تقویت کا باعث ہوں گے کیونکہ اقتصادی و معاشی مساوات ایک بہترین اور مجوزہ نظام حکومت کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر شعوری انقلاب لانے کی ضرورت ہے مگر اس نوع کے انقلاب کا علم اُن عناصر کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جو مثبت اقدار حیات کے حامل اور علم ذات سے عملاً بہرہ اندوز ہوں کیونکہ آخر کار انہیں کو ہی نظام حکومت بھی چلانا ہوگا۔

جس طرح دوران خون رُک جانے سے جسم کا کوئی حصہ بے کار یا متورم ہو جاتا ہے اور اس بات کا اثر پورے اعضائے جسمانی پر پڑنا ناگزیر ہے کیونکہ پورا جسم بیمار اور دکھی ہو جاتا ہے اسی طرح معاشرہ انسانی جو ایک عالمگیر اکائی جسم ہے جو مٹھی بھر افراد کے زراندوز اور سرمایہ پرست ہو جانے سے بری طرح متاثر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ان گنت انسان ابتدائی اور بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں چند کنبے سرمائے اور دولت کے وسائل پر قابض ہو کر اپنے کروڑوں ہم جنسوں سے ڈھور ڈنگروں کی طرح سلوک کرتے ہیں اور دولت کے بل بوتے پر ان کے دماغوں' ذہنوں' خیالوں' جسموں پر متصرف ہو جاتے

ہیں یہیں سے غلاموں لونڈیوں اور کنیزوں کی تجارت شروع ہوتی ہے جس کا سلسلہ کسی نہ کسی بدلی ہوئی شکل میں اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک سرمایہ دارانہ نظام باقی رہتا ہے ایسے غیر فطری نظام کو غیر انسانی نظام نہ کہنا پرلے درجے کی نہ صرف بددیانتی ہے بلکہ ایک عظیم حماقت ہے۔ جس میں اہل قلم کی عصمت و قلم خرید لینے کے علاوہ دختر حوا کی عصمت بھی زر کے ترازو میں فروخت ہوتی ہے۔

غیر منصفانہ تقسیم زن

ویسے ہر طرح کی غیر منصفانہ تقسیم سرمایہ دارانہ معاشرے کی خصوصیت ہے۔

لیکن میں صرف غیر منصفانہ تقسیم کار، غیر منصفانہ تقسیم زن پر خاص طور پر تبصرہ کرنا ضروری سمجھوں گا۔ کیونکہ معاشرہ انسانی ذہنی بنیادی بے انصافیوں کا شکار ہو کر لاتعداد مصائب دام کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔

غیر منصفانہ تقسیم زن سرمایہ دار معاشرے کی وہ فرد جرم ہے جس کی وجہ سے معاشرہ انسانی غیر فطری عادات واطوار کا شکار ہو گیا ہے کیونکہ عورت وہی رکھ سکتا ہے جو سرمایہ دار ہو یا برسر بعتدگار۔ جبکہ معاشرے پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے چنانچہ قحبہ خانے اور ہیجڑوں کی منڈیاں سرمایہ پرست نظام حکومت ہی کی عطا کردہ نعمتیں ہیں دوسری طرف امراض خبیثہ (ظاہری اور خفیہ بیماریاں) بھی اسی غیر فطری نظام کی پیداوار ہیں۔

اغلام بازی، مشت زنی، لواطت، زناکاری، قمار بازی کے علاوہ اسمگلنگ، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور نفع اندوزی وغیرہ بھی اسی کے عطیے ہیں الغرض اس غیر فطری نظام ہی کے نتیجے میں تمام قسم کے غیر فطری افعال سرزد ہوتے ہیں اس معاشرے میں کثرت اولاد کو روکنے کی مہمات سرگرمی سے جاری ہوتی ہیں جو برتھ کنٹرول کے ذرائع اختیار کرنے کی افادی اہمیت پر زور دیتی ہیں کیونکہ دولت اور پیداوار کے وسائل پر اس معاشرے کے مٹھی بھر خاندان قابض ہوتے ہیں جو سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں اور خود ہر طرح کی رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ کیا حسن کے بازار یا قحبہ خانے اور میخانوں کے اڈے غلاموں

کنیزوں ہی کی تجارت کی بگڑی ہوئی صورتیں نہیں ہیں؟ سرمایہ دار معاشرے میں عظمت کا معیار دولت اور سرمایہ ہوتا ہے۔ جس کے حصول کے ذرائع سراسر ناجائز ہوتے ہیں مگر سرمایہ دار اور دولت مند لوگوں کو "شرفا" کا خطاب دیا جاتا ہے حالانکہ سرمایہ داری پرلے درجے کے کمینہ پن، سنگدلی اور بے رحمی کا نتیجہ ہے۔

جہاں غیر منصفانہ تقسیم زن ہو۔ وہاں ایک طرف نسوانیت کی مٹی پلید ہوتی ہے اور ایک طرف اُسے سرمایہ دارانہ تہذیب کے کھلونے دے کر بہلایا جاتا ہے اور ایسی نسوانی تحریکوں کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔ جن کا مقصد اُسے فطری حقوق کی طرف سے غافل رکھنا اور "جبذبانہ بے حیائی اور عصمت فروشی" کو حقوقِ نسواں کا نام دینا ہوتا ہے چونکہ سرمایہ دار معاشرے میں رواج کے رسمی قوانین ہوتے ہیں اس لئے بے چارا طبقہ نسواں بدستور زمانہ قدیم کی سی بردہ فروشی سے دوچار رہتا ہے۔

اس معاشرے کی نظر میں یہ قوانین تقدس کا درجہ رکھتے ہیں حالانکہ ان کی موجودگی میں عورت لونڈی کنیز رکھنے کی قدیم ذہنیت کا شکار ہے ان مروجہ رسمی روایتی اور غیر فطری قوانین کی وجہ سے بے شمار لڑکیاں سنِ بلوغت کو پہنچ جانے کے باوجود اپنے سنگدل والدین کی ذہنیت کا شکار ہوتی ہیں کیونکہ اگر ان کے والدین سرمایہ دار نہیں ہوتے تو سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں اس طرح لڑکے بلوغت کی عمر کو پہنچ جانے کے باوجود وحدت کے بغیر رہتے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ تذکیر و تانیث کے دونوں شعبوں میں غیر فطری افعال کا ارتکاب ہوتا ہے۔ یہیں سے چھپنی کھیلنے (اس کی جدید شکلیں اب اور ہو چکی ہیں جبکہ غیر فطری طور پر شہوانی بھوک کو ہٹانے کے لئے آلات بھی ایجاد کر لئے گئے ہیں اور یہ سب کچھ سرمایہ دارانہ معاشرے ہی کی حرکات مذلوحی ہیں) اور دیگر غیر فطری ذرائع سے شہوانی تسکین کے سامان ایجاد ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ زنا کاری اور اغوا بازی کے محرکات جنم لیتے ہیں۔ دوسری طرف اغلام بازی، لواطت، فطرت زنی اور دیگر غیر فطری استقلال کی تخلیق ہوتی ہے اور یہیں سے سوزاک، آتشک، جریان، لیکوریا، سیلان الرحم اور جریان وغیرہ امراض آغاز پذیر ہوتی ہیں۔

معاشرۂ انسانی میں شہوانی بھوک مٹانے کا جب غیر فطری اور اجتماعی نظام نافذ نہیں ہوتا اُس وقت تک عورت اور مرد زندگی کی مشین کے کارآمد پرزے ثابت نہیں ہو سکتے۔ منصفانہ تقسیم اور نظامِ منصفانہ مساوات انسانی کی فطری بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے۔ کیونکہ مذہبی معاشرہ میں جو سرمایہ داروں ہی کا ایجنٹ ہوتا ہے غیر فطری اخلاقی قیود انسان کے فطری حقوق کو بے رحمانہ پامال کئے رکھتے ہیں اور اس کے خوفناک اثرات اپنے ردِعمل کے طور پر پوری نسلِ انسانی کو شطرنج بنا کر رکھ دیتے ہیں فطری جذبوں کو دبانے یا کچلنے کا ردِعمل بڑا ہی بھیانک ہوتا ہے۔

چونکہ علم ذات کی رُو سے عورت اور مرد برابر ہیں۔ کیونکہ روح میں تذکیر و تانیث نہیں۔ اس لئے دونوں اوصاف کو یکساں انسانی حقوق سے متمتع ہونا چاہیے مگر سرمایہ دار معاشرے میں ہر چیز دولت کی کسوٹی پر رکھی جاتی ہے حالانکہ اس معاشرے میں دولت اُن پست ترین اوصاف رکھنے والوں کے پاس بھی دیکھی جاتی ہے جو علم ذات کی رو سے انسان کہلانے کے بھی حقدار نہیں ہوتے۔

جس معاشرے میں انسانی عظمت کا معیار دولت مندری اور سرمایہ داری ہو۔ وہاں عظمت و تقدیس کے سوا اور سب کچھ ہی موجود ہوتا ہے کیونکہ دولت حاصل کرنے کے ذرائع انسان جوہروں کی بجائے مکروفریب ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ ہوتے ہیں جہالت کی حد تو یہ ہے کہ ایسے انسان نما درندوں کو شرفا کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

جس طرح علم ذات کا حصول مرد کے لئے ناممکن نہیں۔ اسی طرح عورت بھی اس کو حاصل کر سکتی ہے عورت کا بھی وہی ذہن ہے جو مرد کے پاس ہے یہ اور بات ہے کہ صدیوں کے پسماندہ ترین اور ستم رسیدگی کے ماحول میں رہ کر عورت کا ذہن ایسے سانچے میں ڈھل گیا ہے کہ یہ اُسے ذہن نشین کرانے کی سازش معلوم ہوتی ہے کہ اُسے مرد کے مقابلے میں ضعیف العقل قرار دیا جاتا رہا ہے یہ صرف پسماندہ اور ظلمت ماحول ہی کا اثر ہے کہ وہ خود بھی ابھی تک ظلم سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکی۔ حالانکہ اگر سرمایہ دار ممالک کی یونیورسٹیوں کے امتحانات کا بھی جائزہ لیا جائے تو اسی فیصد عورتیں یا لڑکیاں اعلیٰ درجے کے امتحانات

میں نہ صرف نمایاں طور پر کامیاب ثابت ہوتی ہیں بلکہ اول اور دوم بھی آتی ہیں۔ پھر یہ کیسے باور کرلیا جائے کہ عورت فطری طور پر ضعیف العقل ہے البتہ مرد کی حاکمانہ اجارہ داریوں نے اُسے اس حالت تک پہنچادیا ہے۔

چونکہ فطرت کا قانون مساوات روئے زمین پر کسی کو پیدائشی اور فطری حقوق سے محروم نہیں رکھنا چاہتا اس لئے مادر فطرت اپنے بچوں کی کسی پسماندہ اور امتیازی حالت کو برداشت نہیں کرسکتی۔ وہ چاہتی ہے کہ بلوغت کے آثار ظاہر ہوجانے پر عورت اور مرد دونوں شہوانی تقاضے فطری طور پر پورے کریں۔ اور معاشرہ انسانی سے غیر فطری عوارض کا خاتمہ ہوجائے سرمایہ دار معاشرے کی پیدا کردہ دست برد سے نجات مل جائے اور ہر انسان عملی طور پر محسوس کرے۔ وہ کل انسانی کی یونیورسل فیملی کا ممبر ہے۔ جس کا ہر ممبر یکساں طور پر فطری حقوق سے سرفراز ہے۔

دراصل نسلی' قومی' قبائلی' مذہبی یا جغرافیائی تعصبات اُن ادوار جہالت کی یادگار ہیں جب انسان کا ذہن زمان و مکان کی حدود میں مقید تھا جب اُس کے شعور نے ارتقائی مدارج طے کرکے علمی صداقتوں کا کھوج نہیں لگایا تھا جب انسان چھوٹے چھوٹے گروہوں' خاندانوں، قصبوں، قوموں اور قبیلوں میں منقسم تھا جب اُسے یہ علم ہی نہ تھا کہ یہ دھرتی کیا ہے؟ اور آسمان کسے کہتے ہیں؟ اس دور میں وہ مہر و ماہ و انجم پر کمندیں ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ راکٹ کے ذریعے چاند کی وادی میں معدنیات کا سراغ لگانا چاہتا ہے

وہ جمادات، نباتات، حیوانات اور نوعِ انسانی کے بارے میں کم از کم اتنی معلومات رکھتا ہے جو اس کے اجداد نہیں رکھتے تھے اگرچہ وہ عام طور پر علم ذات سے ابھی بے خبر ہے اور برترین علمی صداقتوں کا کھوج لگانے کی طرف سے بے توجہی برتتا ہے مگر ایٹمی دور کا انسان شدت کے ساتھ معاشرہ انسانی کی تعمیر و ترقی کو محسوس کرتا ہے جو فطری تقاضوں کی حامل ہو۔

غیر منصفانہ تقسیم کار

سرمایہ دار معاشرے میں انسان کا معیار قابلیت بھی غیر فطری پیمانے کا حامل ہوتا ہے

اس لئے اس میں اونچ نیچ اور دیگر قسم کے لاتعداد امتیازات کا رونما ہونا ایک یقینی بات ہے کیونکہ تقسیم کار کا اصول سب سے پہلے تو سرمایہ دار طبقے کے مٹھی بھر افراد سے شروع ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ خویش پروری اور جانبداری کے ساتھ ساتھ مختلف انواع رشوت ستانیوں کو جنم دیتا ہو محدود قسم کی اپنائیت پر ختم ہو جاتا ہے رہا تعلیمی قابلیت کا معاملہ اس بات سے قطع نظر کہ اس معاشرے میں تعلیم کمرشل بنیادوں پر ہوتی ہے تعلیم قابلیت کا حصول بھی سرمایہ دار معاشرے کے مٹھی بھر خاندانوں تک محدود ہوتا ہے کیونکہ سرمایہ دار ممالک میں تعلیم دانستہ طور پر گراں ہوتی ہے تاکہ صرف سرمایہ دار کا خاندان ہی اس کو حاصل کر سکیں۔ اور سرکاری اداروں میں ملازمتیں پا سکیں۔ علاوہ ازیں تعلیمی معاملات میں سرمائے اور افلاس کا امتیاز قدم قدم پر نمایاں رہتا ہے اُونچی ملازمتوں کے دروازے سرمایہ داروں کی اولاد کے لئے ہر وقت کھلے ہوتے ہیں آسامیاں اخبارات میں رسمی اشتہار دینے سے قبل ہی پر کر لی جاتی ہیں "مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ" کے مطابق سفارشات کا سلسلہ بھی حیرت ناک طور پر پھیلا رہتا ہے اس لئے کلیدی آسامیاں سرمایہ دار خاندانوں تک محدود رہتی ہیں۔ اور اگر غریبوں کی اولاد نوکری کرتی ہے تو زیادہ سے زیادہ چپڑاسیوں' کلرکوں' ضلعداروں اور پولیس اور فوج کی نہایت چھوٹے پیانے کی ملازمتوں تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔

کارخانے اور ملیں بھی سرمایہ داروں کی ہوتی ہیں جہاں کارخانہ اور محنت کشوں کے امتیازی سلوک کا منظر نہایت سفاکانہ نظر آتا ہے کیونکہ سرمایہ پرستی ایک عظیم ترین لعنت ایک طاعون اور ایک کوڑھ ہے جو انسانیت کو لقمہ اجل بنا رہا ہے اکثر سرمایہ پرستی کے مہلک جراثیم نامعلوم طریقوں سے اس تیسرے درجے کے طبقے میں بھی سرایت کر جاتے ہیں جو مڈل کلاس میں داخل ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ بھی بددیانتی، مکروفریب اور ظلم وستم کو اپنا کر سرمایہ دار بننے کے خواب دیکھتے ہیں وہ بالآخر نو دولتیوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور سرمایہ دار طبقے میں گھلنے ملنے کی کوشش کرتے ہیں اب تو نام نہاد جمہوری نظام کے سلسلے میں انتخابات نے یہ مشکل حل کر دی ہے کہ چھوٹے درجے کے لوگ الیکشن لڑتے ہیں اور سرمایہ داروں کے سے ہتھکنڈے اختیار کر کے اور ان کی ہاں میں ہاں ملا کر کامیاب ہو جاتے ہیں اس طرح وہ

سرمایہ داروں ہی کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور اُن کے بہترین دلال ثابت ہوتے ہیں ان کے اقتدار کی لرزتی ہوئی کرسیوں کو وقتی طور پر سہارا دینے کے صلے میں انہیں قربت نصیب ہو جاتی ہے۔ اس طرح سرمایہ دار طبقے میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔

اکثر سرمایہ دار طبقہ اور اس قسم کے سیاسی نودولتیں عوامی تقاضوں کی باتیں کر کے عوام کے طبقہ جہلا میں ہر دلعزیز ہونے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ بیچارے عوام تو پہلے ہی سرمایہ دارانہ نظام کی ملی بھگت کا شکار ہوتے ہیں ان کی زبان سے ایسی باتیں سن کر اُن کی منافقت اور فریب کاری کا احساس کرنے کی بجائے انہی عوامی راہ نما کا خطاب عطا کرنے سے بھی بخل نہیں برتتے الغرض تقسیم کار کا معیار سرمایہ پرستی یا سرمایہ پرستانہ ذہنیت ہے اور بس لیکن اس غیر منصفانہ تقسیم کار کی وجہ سے ان گنت انسان بے روزگاری، افلاس اور بیماری کے ظالم شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں چنانچہ اس معاشرے میں انسان کا خودکشی کر لینا معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔

اس صورت حال کے خلاف پروٹسٹ کرنے والوں کو یا تو جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے یا لاٹھیوں اور گولیوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے ورنہ ان کے لیڈر بھی اکثر درپردہ سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر افلاس زدہ انسانوں کے خلاف سازشیں کرتے ہوئے پائے گئے ہیں جنہیں ایک طرف عوام میں مخلص اور ہمدرد راہ نما مشہور کر دیا جاتا ہے اور دوسری طرف انہیں حکومت کی طرف سے انعامات حاصل ہوتے ہیں اکثر عوام اُن کا بھرم زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے انہیں کچھ دیر گرفتار کر کے جیلوں بھی ٹھونس دیا جاتا ہے مگر ان کی مقررہ تنخواہیں یا تو بنک میں جمع ہوتی رہتی ہیں یا ان کے گھروں میں پہنچا دی جاتی ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ دار معاشرے میں خدمتِ خلق، خدمت انسانیت، ہمدردی عوام، عوامی قیادت، صحافت، تجارت، سیاست، ادب اور ثقافت سب کے سب منافقت، ریاکاری، مکروفریب اور ملمع سازی ہی سے آئینہ دار ہوتے ہیں اس سماج کی مسکراہٹوں میں بھی ریاکاری کے نشتر چھپے ہوتے ہیں اس بزم کا ساقی بھی ساغرے میں زہر ملا دیتا ہے ہاں انتہائی مہلک زہر جو ہر قابل قدر ناشناسی کی نذر ہو جاتا ہے اور نالائق

ظالم اور مکار لوگ اقتدار کی اونچی اونچی کرسیوں پر جلوہ افروز دکھائی دیتے ہیں افلاس زدہ طبقوں کی اولاد سوکھے ٹکڑوں کو ترستی ہے اُن کے جسم چیتھڑوں تک سے محروم ہوتے ہیں مگر سرمایہ دار لوگوں کے پالتو کتوں کے لئے بھی موسم کے لحاظ سے پوشاک اور غذا کا بہترین انتظام ہوتا ہے سرمایہ دار سماج میں علم وفن اور ان کی مجالس وغیرہ محض استحصال کا ایک وسیلہ ہیں جنھیں فنکار اور دانشور قسمت کے گلہ سنج نظر آتے ہیں اور قدر ناشناسی کا رونا روتے دکھائی دیتے ہیں مگر اُن کو فنکار اور دانشور سمجھا جاتا ہے جو در پردہ اس سماج کے مفادات کی نگہداشت کرتے ہیں۔

اس صورت حال کی عظیم ذمہ داری مذہب پر عائد ہوتی ہے جس کے ذریعے ہمیشہ عوام الناس کو شکار فریب کیا جاتا رہا ہے چنانچہ انہیں بہلانے، ورغلانے اور اُن کی آنکھوں میں مکر کا غبار جھونکنے کی غرض سے خیرات اور زکات کے دقیانوسی حربے بھی استعمال کئے جاتے ہیں جو بے شک اس دور ارتقا میں غیر مستعمل، بے اثر اور بے فائدہ ہیں مگر جہاں جہاں مذہبی جہالتوں کا راج ہے وہاں وہاں یہ حربے اب بھی موثر اور کارگر ثابت ہوتے ہیں۔

ورنہ ایک عالمگیر اقتصادی مساوات کے نظام میں زکات اور خیرات وغیرہ کا مضحکہ خیز اور جذبہ احترام آدمیت کا کھلا مذاق اُڑانے والا سسٹم قطعی بے معنی اور فضول ہے کیا یہ بات انسانیت کی توہین نہیں کہ ایک تو سرمایہ دار لوگ زراندوزی کے خلاف فطرت حربوں سے کام لے کر بے شمار انسانوں کو مفلوک الحال، مفلس مجبور اور مظلوم بنا دیں۔ پھر اُن کی مجبوری اور غریبی کا مذاق اُڑانے کے لئے انہیں بھکاریوں کی طرح اپنا دست نگر بنا دیں۔ کیا یہ سب قیامت سے کچھ کم ہے کہ اس معاشرے میں انسان انسان کے آگے دست احتیاج دراز کرنے پر مجبور ہو۔ اور اُس کی خودداری کا جنازہ نکال کر رکھ دیا جائے۔

مستزاد یہ کہ اس طرزِ عمل کو مذہب کے خلاف فطرت اعتقاد کا رنگ دے کر کہیں زکوٰۃ اور کہیں خیرات کہا جائے۔ سرمایہ دار معاشرے میں زکوٰۃ اور خیرات ایسی لعنتوں کا وجود ہی اس امر کی زندہ دلیل ہے کہ معاشرہ انسانی ذلت سے کس طرح دوچار ہے اور اس معاشرے

میں اقتصادی مساوات کا قطعی فقدان ہے چنانچہ اس پر سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کے قابض ہونے کی شہادت مل جاتی ہے۔

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

رسالہ "اقبال" لاہور شمارہ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک پروفیسر صاحب کا مضمون یا مقالہ چھپا ہے۔ جس کا عنوان "اقبال اور قلندریت" ہے انہوں نے اپنے اس مضمون میں مقام قلندریت کے علاوہ اقبال کے مسلک قلندری پر بھی روشنی ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے مگر قلندریت پر جس کے بارے میں قلندر وقت حافظ شیراز کہتا ہے۔

ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

کیا کوئی ایسا شخص تبصرہ کرنے کی جسارت کرسکتا ہے جو عملاً کسی روحانی مقام پر فائز ہو نہ اُسے رُوحانی مسالک کا عملی تجربہ و مشاہدہ ہو؟ ظاہر ہے جب کوئی ایسا شخص ایسی کوشش کرے گا۔ جو قلندر نہیں۔ تو وہ کتابی علم و دانش رکھنے والے طبقوں میں لاکھ و قیع ہوسکتا ہے۔ مگر اہلِ حقیقت اُسے جا بجا غلط فہمی میں مبتلا پائیں گے کیونکہ تصوف دیانت، علمِ ذات یا رُوحانیت اور ان کی رسمی و مروجہ اصلاحیں اور ان کی حقیقی معنویت کا حقیقی ادراک بھی دشوار ہے تا نکہ کوئی سالک نہ ہو اس دور میں مروجہ رُوحانی اصطلاحیں استعمال کرنا بھی موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے راقم الحروف براہ راست دنیا کے انسانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کرتا ہے اور یہ بات فقط سمجھانے کی خاطر ہے ورنہ فی الواقع تمام دنیا کے انسانوں میں کوئی فرق نہیں اور فرق ہے بھی تو کیوں ہے؟ اسی فرق و اختلاف پر روشنی ڈالی جارہی ہے چنانچہ نا چار نوعِ انسانی کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) جسمانی (۲) ذہنی (۳) رُوحانی۔ کیونکہ انسان جسم، ذہن اور روح سے مرکب ہے جسم کی ترکیب عناصر اور محسوسات سے ہوئی ہے لیکن جسم ظاہری گاڑی کی طرح ہے اور محسوسات کو باگیں سمجھ لیجئے ذہن جن کا ماخذ ہے اور روح کو سوار تصور کر لیجئے۔

اگر ذہن محض جسمانی ڈھانچوں میں ڈھل جائے تو روح بھی اُسی کے مطابق ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اِس صورت میں سوار گاڑی کو منزلِ مقصود پر لے جانے میں وصرف دقت محسوس کرے گا بلکہ قدم قدم پر نہ صرف ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوگا بلکہ ان گنت حادثات سے دوچار ہونا پڑیگا۔ گاڑی کی شکست وریخت سے بھی عہدہ برآ ہوگا۔ کیونکہ سوار کے سامنے کوئی راہ ہے نہ منزل نہ اُسے گاڑی ڈرائیو کرنے کی مشق یا مہارت ہی حاصل ہے۔

(دلِ آگاہ کے بغیر مقامات سلوک طے نہیں ہو سکتے)

جسمانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے لوگ بظاہر انسان یا آدمی کہلاتے ہیں مگر فی الواقع وہ حیوانِ ناطق ہوتے ہیں کیونکہ ان کے نطق کے سوا باقی سب اوصاف پسماندہ انواع مخلوقات سے ماخوذ ہوتے ہیں ایسے لوگ فنونِ لطیفہ کی کسی نوع یا فرع میں بھی کمال حاصل نہیں کرسکتے کیونکہ ان کے پاس صرف جسمانی ذہن ہوتا ہے اولاً تو اُن کا فنونِ لطیفہ شاذ ہی تعلق ہوسکتا ہے ثانیاً اگر ہو بھی تو وہ روایتی، مروجہ تقلیدی یا میکانکی قسم کے ہوتے ہیں وہ معاشرے یا تہذیب کو چار چاند نہیں لگا سکتے ان میں حسد، کینہ، بغض حرص، غصہ اور شہوت کے حیوانی جذبات وافر ہوتے ہیں ان کے سامنے منزلِ مقصود ہوتی ہے نہ اُسے حاصل جذبات وافر ہوتے ہیں ان کے سامنے منزلِ مقصود ہوتی ہے نہ اُسے حاصل کرنے کا شوقِ فرواں ہوتا ہے ان کا نظریات علم اپنے جیسے پست تر یا پست ترین طبقوں ہی کے خیالات، رسومات' عقاید' نظریات اور روایات پر مبنی ہوتا ہے ان کی زندگی جذباتی ہوتی ہے اور اندھا دھند اُن کے اشغال زر اندوزی منفعت اندوزی، چور بازاری، رشوت خوری، بددیانتی، دروغ اور لوٹ کھسوٹ وغیرہ کے ساتھ ساتھ رکھی، مفروضہ اور مبینہ عقاید ونظریات کی نمائش اور بجا آوری بھی ہوتے ہیں چونکہ ان تمام اشغال کی بنیاد جہالت پر ہے اور جہالت ہی ہر نوع کے ظلم وستم کا سرچشمہ ہے اس لئے اس طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ہمدردی، انصاف اور مساوات انسانی کے اوصاف جمیلہ نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک یہ اوصاف بھی تاجرانہ بنیادوں پر ہوتے ہیں اس طبقے کو بھی مختلف انواع اور شعبوں میں بانٹا جاسکتا ہے مگر من حیث المجموع یہ تمام طبقہ انسانیت کا حقیقی مقصد پورا کرنے سے قاصر ہے

کیونکہ ظاہر ہے کہ تمام تر معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی برائیوں کا سرچشمہ اوصاف حیوانی یا ان کے نتیجے میں پیدا شدہ نتائج ہی ہیں۔

اس طبقہ کا علم وعمل جہالت کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اس طبقے میں ذہنی اور ارتقائی انقلاب پیدا کرنے کے لئے تعلیم کے مروجہ ذرائع بہت کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں مثلاً ریڈیو اور فلم وغیرہ۔ بشرطیکہ ان کے ذریعے حقیقی مقصد حیات کی ترویج ہو۔ ریڈیو اور فلم براہ راست حواس خمسہ پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر چونکہ ان پر بھی اسی طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک نوع ہی کو اجارہ داری قائم ہے اس لئے فی الحال مطلوبہ مجوزہ تعمیری و تخلیقی انقلاب کا پیدا ہونا محال نظر آتا ہے۔

لیکن فوری طور پر ذہنوں کا استحصال کرنے کے لئے قدرت عظمہ کے پاس اسی قسم کے طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کے لئے زلزلے طوفان اور وبائیں وغیرہ ہیں۔ جنہیں آفات ارضی وسماوی کہا جاتا ہے۔

جسمانی لوگوں کا وہ طبقہ جو تعلیم یافتہ یا باشعور کہلاتا ہے اس میں مطلوبہ تعمیری و تخلیقی انقلاب لانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ لٹریچر نصاب تعلیم اور صحافت وغیرہ کا نظام اُن اجزائے ترکیبی کے ہاتھوں سے چھین لیا جائے۔ جو اسی طبقے کے ایجنٹ ہیں اور ان کی جگہ اُن لوگوں کو برسر اقتدار لایا جائے جو ارتقائی طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔

جسمانی طبقے اور اس کی مختلف انواع سے تعلق رکھنے والے فنکاروں اور دانشوروں کی فہرست میں اقبال جیسے (REACTIONARY) دانشور بھی ہیں۔ جو اپنے جیسے مفکروں سے اکتساب فیض کرتے ہیں خواہ وہ ذہنی ہوں یا رُوحانی اگرچہ بظاہر اقبال جسمانی طبقے سے باہر دکھائی دیتا ہے مگر اس کے افکار اسی طبقے یا اس کسی نوع ہی کے لئے مختص ہیں کیونکہ موجودہ ارتقائی دور کے فن کار یا مفکر علم و تجربہ کی لامتناہیت سے ہمکنار ہو کر ماضی کے اندھیروں سے نکل چکے ہیں۔

نوع انسانی کا دوسرا طبقہ ذہنی لوگ ہیں

ذہنی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ موجودہ دور ارتقائی ہے جس میں

انسان جسم سے برتر سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے جسمانی نشوونما کی بجائے ذہنی تربیت اور پرورش درکار ہے جسمانی لوگوں کی ایجادات شمشیر زنی، پہلوانی، کبڈی اور مکہ بازی وغیرہ کے علاوہ اس طرز کی ہیں جو جسمانی تعمیر یا تخریب کی آئینہ دار ہیں مگر ذہنی لوگوں کی ایجادات ذہنی تعمیر یا تخریب کی ترجمان ہیں مثلاً ذہنی ارتقا سے تعلق رکھنے والی سائنس دو قسم کی ہے (۱) مثبت اقدار زندگی کی حامل (۲) منفی اقدار حیات کا علمبردار"

اگر ذہنی ارتقا مائل بہ تعمیر ہو۔ تو ایٹمک انرجی کی بنیاد پر حیات انسانی کے واسطے مفید ایجادات کرتا ہے جو انسان کو جسمانی کدوکاوش اور محنت شاقہ سے زیادہ سے زیادہ پیمانے پر نجات دلا سکیں۔ اور اگر ذہن آمادہ تخریب ہو۔ تو ایٹمی قوت کو منفی انداز میں استعمال کرنے کے لئے ایٹم بم اور دیگر قسم کا اسلحہ بناتا ہے چنانچہ ذہنی ارتقاء سے تعلق رکھنے والے دانشوروں اور فن کاروں نے زمان ومکان کے فاصلے جسمانی دنیا سے ختم کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ موت اور بیماری وغیرہ پر قابو پانے کے لئے بہت مفید کام کر رہے ہیں وہ خلائی تسخیر کے لئے مصروف عمل ہیں چاند اور دیگر اجرام فلکی کو مسخر کرنے کی جدوجہد کر رہے اس کے ساتھ ہی کل انسانی آبادی کو کسی قسم کی مفروضہ اور مروجہ جسمانی 'ذہنی اور رُوحانی طبقاتی تقسیم ختم کرنے کے بعد ایک آفاقی بھائی چارہ میں تبدیل کر دینے کی عملی مہم بھی سر انجام دے رہے ہیں جہاں معاشرتی، مجلسی، جنسی اور اقتصادی عدم مساوات نہ ہوگی۔

فلسفہ خیال کو سمجھنے والے لوگ اس بات سے باخبر ہیں کہ نفسیاتی عمل کتنا سریع الاثر اور طاقتور ہے؟ ذہنی ارتقا کی کسی نوع سے تعلق رکھنے والے موجدوں کی کوئی ایک ایجاد جسمانی برتری کو اچانک شکست فاش دے سکتی ہے۔ جسمانی ذہنی سے تعلق رکھنے والی معاشرت میں ابھی تک چوپایوں ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ذہنی ارتقا سے تعلق رکھنے والی معاشرت کب سے انہیں سبکدوش کر چکی ہے مگر جسمانی فوقیت اس دور میں جنت الحمقاء میں رہنے والوں کا ذہنی رویہ ہے کیونکہ روزمرہ مشاہدات اس ضمن میں زندہ دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں ہوائی جہاز چند گھنٹوں میں ایک ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہے مگر بحری جہاز، ریلوے ٹرین، بیل گاڑی' تانگہ، رکشا یا موٹر کار اتنی جلدی ہی نہیں پہنچ سکتے۔

اور فن کاروں کو اس معیار پر پرکھتے نہیں نے انفرادی طور پر مسلسل جدوجہد کے بعد تخلیق کیں۔ وہ اس نکتہ نگاہ سے کسی مفکر، دانشور یا فن کار سے متفق ہو کر نظری طور پر اس سے تعاون کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو جاتے کہ اس جسمانی طبقوں ذہنی طبقوں تیسرا طبقہ روحانی ہے۔

اس طبقہ کو بھی مختلف انواع پر مشتمل قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۱) روحانی ذہن رکھنے والے

(۲) مفروضہ ومروجہ روحانی اصطلاح کے مطابق راہ عمل متعین کرنے والے

(۳) روحانیت کو بھی اپنی یا ماضی کی اجارہ داری سمجھنے والے

(۴) تقلید اور نقل کے عادی

(۵) علم ذات کے مطابق روحانی ارتقا اختیار کرنے والے۔

(۶) ماضی پرستانہ ذہنیت کے عامل۔

(۸) ان پڑھ اور ناخواندہ

(۸) دکاندار قسم کے

(۱۰) قبر پرست۔

ان تمام انواع اور طبقوں سے عظیم ترین طبقہ قلندری ہے۔ جو ازل تا ابد جسمانی ذہنی اور روحانی ارتقا کے نکتہ عروج پر ممکن ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو نطشے کی اصطلاح میں سپر مین (فوق البشر) ہے اور اقبال کی مفروضہ مروجہ روایتی زبان میں مرد قلندر، مرد مومن مرد فقیر" وغیرہ ہے مگر اقبال نے ذہن کے اس طبقہ انسانیت سے تعلق رکھتا ہے جو سر قلندری سے علمی طور پر تو باخبر ہے مگر عملاً وہ اس منزل لاہوت پر نہ پہنچنے کے باوجود وقت کے قلندر سے بزعم خویش اس طرح فیض یاب رہا۔ کہ اُسے شعوری طور پر یہ علم نہ ہوا کہ قلندر وقت کون تھا؟ اور اس دور کے مطابق اس کا روحانی رول کیا تھا؟ چونکہ اُسے علمی طور پر بھی جو آگاہی حاصل تھی۔ وہ عام فکر ونظر کے لوگوں سے امتیازی تھی۔ اس لئے وہ سرچشمہ لاہوت سے وابستہ رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا اگر اُسے اس حقیقت کا شعور حاصل ہو جاتا تو اس کا طریق فکر ونظر کچھ اور بھی یعنی وہ قلندریت کو محدود قوم پرستی میں سمونے کی بجائے ایسی آفاقیت کا علوم کیا

اب حتمی انداز میں ذہن رسا کے کرشمے دیکھئے کئی کروڑ لوگوں پر مشتمل عساکر کو معمولی سے وقفے میں ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سُلا دینے والی گیس اور بم ایجاد ہو چکے ہیں جسمانی معیار کا انحصار ذہنی ارتقا پر ہے جن لوگوں کا ذہنی معیار بلند ہے۔ اُن کی گفتار رفتار اور کردار بھی بلند ہے ذہنی ارتقا رکھنے والے فن کاروں اور دانشوروں کو سمجھنے کے لئے ذہنی ارتقا ہی درکار ہے اگر ذہنی ارتقاء کا دارومدار ماضی کے دانشوروں کی تصانیف یا تجربات ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ ''ذہنی ارتقاء'' ''ترقی معکوس'' کہلائے گا۔

مثلاً اگر اُردو زبان میں کوئی غالب بننے کی کوشش کرتا ہوا اُس کا سا انداز بیان اختیار کرتا ہے اور اُسی فکر ونظر کی ترجمانی کرتا ہے جو غالب نے کی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے کیونکہ اُس کا ارتقائی ذہن غالب سے آگے نہیں جا سکا۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کی مقبول زمینوں میں شعر کہتا ہے اور وہی انداز بیان بھی اختیار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ارتقا کا مقصد پورا نہیں کرتا کیونکہ جو لوگ اپنے زمانوں میں کسی شعبے میں انفرادیت پیدا کر کے بام شہرت پر جلوہ افروز ہو جاتے ہیں ان کی تقلید کرنے والے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں وہ جس مقبولیت وشہرت کے لالچ میں ایسا کرتے ہیں وہ انہیں کا حصہ تھی۔ حالانکہ آخر کار مرور وقت انہیں بھی فقط تاریخی یادگاروں کی حیثیت دینے کے سوا اور کچھ نہیں دے سکا۔

ذہنی طبقے سے تعلق رکھنے والی مختلف انواع ہیں۔

(۱) وہ جو ذہنی قوتوں سے کام لے کر کرامات 'خرق عادات اور معجزے سرانجام دیتے ہیں۔

(۲) وہ جو ذہن کی حقیر قوتوں سے کام لے کر مسمریزم، ہپناٹزم اور سحر عملیات کا کاروبار کرتے ہیں۔

(۳) وہ جو ذہنی ارتقاء سے کام لے کر لٹریچر کی نشوونما کا موجب بنتے ہیں اور اپنا راستہ خود بناتے اور انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔

(۴) وہ جو ذہنی ارتقاء کا راز معلوم کرنے کے بعد اپنی اختراعات سے تہذیب وتمدن کو مالا مال کرنے منہمک رہتے ہیں

(۵) وہ جو انفرادی طور پر ذہن کی ارتقائی کیفیات سے باخبر ہو کر دانشوروں مفکروں

ہوتا۔ جہاں نہ مذاہب و اقوام کی تمیزیں ہیں نہ رنگ و نسل کے امتیازات۔

عام پڑھا لکھا طبقہ سمجھتا ہے کہ اقبال کا فلسفہ خودی کوئی نئی بات ہے مگر وہ لوگ جو ذہنی ارتقا کے مدارج و مقامات کو طے کرنے کے بعد کمال و زبان حاصل کر چکے ہیں جانتے ہیں کہ اس معاملے میں بھی اقبال علمی ہیں کیا؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اقبال کے مداحین کی ایک کثیر تعداد اُسے بوعلی قلندر سے بھی اعلیٰ و برتر سمجھتی ہے اور تصوف اور علم ذات کے رکھے نظریات سے بالاتر سمجھتے ہوئے کہتی ہے کہ "اقبال کے نزدیک خودی کی نفی موت ہے جبکہ قلندری مسلک میں خودی کی نفی عین زندگی ہے فکر و نظر کے اعتبار سے دونوں (اقبال اور بو علی قلندر) کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔

اس ضمن میں بوعلی شاہ قلندر کے اشعار بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔

تو مباش اصلا کمال ایں است و بس
تو درو گم شو وصال ایں است و بس
تو نمائی . با خدا یا و بی وصال
خویش را گم ساز اے صاحب جمال
تا توئی کے یار گردو یار تو
چوں نباشی یار گردو یار تو

اپنے اعتراض کے جواز میں فرماتے ہیں۔

قلندر کی خودی کی فنائیت اس درجہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر اس چیز سے منقطع کر لیتا ہے جو اللہ سے دور کرے اور یہ اُن کے کمال فنائیت کے مرتبہ پر فائز ہونے کی دلیل ہے۔ قلندریہ عقیدہ کے مطابق جب تک انا کا تصور موجود ہے شرک موجود ہے مقالہ نگار فنا و بقا کے راز سے بے خبر ہے جیسے خود اقبال فقط علمی طور پر سر قلندری سے باخبر ہونے اور مراقبہ وغیرہ کی قسم کے ابتدائی مراحل کو جاننے کے بعد اپنے آپ کو بھی قلندر سمجھ بیٹھا ہے کیونکہ فنا و بقا کے مدارج طے کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لئے ابتداً نفس امّارہ کو زیر کرنے کی ضرورت ہے اور نفی ہستی کے لئے جادہ پیما ہونا پڑتا ہے اقبال کو مراقبے کے ذریعہ

فقط یک سوئی حاصل ہوگئی تھی اور محض یک سوئی کا حصول مرتبہ قلندری پر فائز ہو جانے کی دلیل نہیں۔ اس طرح مقالہ نگار نفی ہستی کے راز سے قطعی بے خبر ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ جو ازل سے لے کر ابد تک قلندران وقت انا کا تصور تک مٹا دینے کی خاطر سالہا سال خلوت گزیں رہتے ہیں اور ایک خاص قسم کی مجاہدے اور مجاہدے کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں حالانکہ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ انا کی کئی انواع ہیں۔ مگر اہل حقیقت کے نزدیک دو طرح کی انا ہے اور تیسری انا وہ ہے جو قلندر کی ہے۔ ایک انائے باطلہ دوسری انائے حقیقی اور تیسری انائے کبیرہ ہے۔

جس طرح عرف عام میں بظاہر تینوں انا ایک ہی انا ہے اسی طرح خودی بھی ایک ہی خودی ہے حالانکہ اسی قاعدے کی رو سے خودی بھی تین قسم کی ہے جھوٹی بھی اور برترین بھی خودی۔ جب تک واقعی جھوٹی خودی یا انائے باطلہ کا ہلکا سا تصور بھی موجود ہے حقیقی خودی یا انائے حق کے چہرے سے نقاب کشائی ناممکن ہے انائے حقیقی کے علمبردار اولیاء اللہ (SAINTS) ہیں اور انائے کبیرہ کے ترجمان تصوف کی مروجہ اصطلاحوں کے مطابق قطب' غوث' ابدال اور قلندر ہیں قلندر فنائے بعد بقا کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے یا بالا لفاظ دیگر وہ کمال ہوش و مستی کا علمبردار ہوتا ہے اس لئے وہ جس انا کا آئینہ دار ہوتا ہے وہ انائے کبیرہ (ذات حق) ہے اور مقالہ نگار بے چارے کو تصوف کی ہوا تک نہیں لگی اور قلندریت کے بارے میں مقالے سپرد قلم کرنے کی جسارت کر رہا ہے جو سوء ادب کی حد تک جسارت ہے بے شک اس نے اقبال کا مطالعہ بھی اسی طرح کیا ہے۔ جس طرح اس نے بوعلی شاہ اور دیگر عرفائے کامل کا کلام پڑھا ہے مگر کیا پڑھ لینے اور اپنے محدود ذہن سے حوالے دے دینے سے کسی ماورائے عقل انسانی بات کی حد تک پہنچنا آسان ہے؟ کیونکہ علم وعمل کی ہم آہنگی کے بغیر کسی بات کی تحقیق کرنا احمقانہ حرکت ہے اور علم وعمل کے بے شمار مدارج و مقامات ہیں مقالہ نگار جس امر کو اعتراض سمجھ رہا ہے وہ اس کی غلط اندیشانہ جہالت پر مبنی ہے اور اس کے جواز کے لئے بوعلی شاہ قلندر کے جو اشعار بطور حوالہ پیش کر رہا ہے وہ الٹا اس کی اپنی جہالت کو نمایاں کرنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہتے ہیں کہ قلندر توحید کے بارے میں کہتا ہے۔

☆☆☆

ہر کہ شد در بحر عرفاں آشنا
ذرہ ذرہ قطرہ داند از خدا
آب دریا و چوں زند موج دگر
در حقیقت آب باشد جلوہ گر
نقش آب و چوں حباب است جسم تو
آب چوں گردی نماند جسم تو
در الف در لام می گردد نہاں
خویش را گم ساز تا گردد عیاں
گشت و اصل چوں بدریا آب جو
آب جورا باز از دریا مجو
تا توئی کے یار گردد یار تو
چوں نباشی یار باشد یار تو

یہ وہ باتیں ہیں جو ازل سے لے کر ابد تک قلندر ان وقت کہتے رہے ہیں کیونکہ حقیقت نہیں بدلتی خواہ اس کا اظہار زمان و مکاں کے ارضی و جغرافیائی اور سیاسی و معاشی اور معاشرتی تقاضوں میں کتنی ہی تبدیلیوں کے ساتھ وقوع پذیر ہیں اگر کسی نے سنسکرت میں یہ باتیں کہیں تو بھی ان کے معانی یہی تھے اگر اردو فارسی انگریزی یا دیگر زبانوں میں ظاہر کیں۔ تو بھی ان کے معانی میں سر مو فرق واقع نہ ہو مگر مقالہ نگار جس کی ظاہری حیثیت خواہ کچھ بھی ہو باطنی طور پر بھی محض ایک عام آدمی معلوم ہوتا ہے اقبال کو شخصیت پرستی کے زعم میں بو علی شاہ قلندر وغیرہ روحانی بے خبر رکھنے پر کمر بستہ رہتے ہیں راقم الحروف کہیں پہلے بھی تحریر کر چکا ہے کہ قلندر سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد باوصف آزاد منش ہوتا ہے اس کی صفات صفات قدرت ہوتی ہیں وہ عناصر خمسہ کی طرح سب کے لئے فیض رساں ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ جس کی سرشت زرخیز ہوتی ہے وہاں سب سے زیادہ اور جلدی اثر ہوتا ہے اور جو سنگلاخ یا شورہ زار سرشتوں کے مالک ہیں وہاں اس کے فیضان کی بارش برعکس اثر انداز ہوتی ہے

اور جن کی سرشت ناپاک اور غلیظ ہے۔ وہاں بدبو اور تعفن جاگ اٹھتا ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم و خس
یا زمین شور سنبل بر نیارو

خود اقبال قلندر کی شخصیت کا ترجمان بن کر کتنے پتے کی باتیں کرتا ہے

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند
زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و ماہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
بروز بزم سراپا چو پرنیاں و حریر
بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند

مندرجہ بالا اشعار مقالہ نگار کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اقبال نفی ہستی کا قائل نہیں۔ اور "خود آگاہی و تن فراموشی" کے نکتہ نگاہ کے مطابق اُس کو فنا بقا کا سر جاوداں بھی معلوم ہے حافظ کہتا ہے۔

ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

اور اقبال حافظ ہی کے شعر کو ذہن نشین رکھتے ہوئے لکھتا ہے

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگر چہ سر نہ تراشد قلندری داند

حالانکہ اُسے اگر چہ لکھ کر خواہ مخواہ تکلف برتنے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ حافظ یہی بات کہہ چکا ہے جو مروجہ طریقوں کے مطابق چار ابرو کا صفایا کر دینے ہی کو قلندری سمجھتے ہیں قلندر نہیں ہوتے۔

اقبال قلندر کی آزاد وشی کے ضمن میں کہتا ہے

دم زندگی ارم زندگی غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر ہم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

لیکن اتنا کہہ دینا ہی کافی نہیں۔ کیونکہ غم زندگی گذارنے اور عظمت قلندری حاصل کرنے کے لئے نظری (Theoratical) اور علمی (Practical) شاہرہ حیات پہ گامزن ہو کر انائے کبیرہ کی منزل پالینے کی ضرورت ہے

چنانچہ بو علی قلندر اس مسلک کے جانشین وقت کہتے ہیں۔

قلندر رانبا شد کفرو ایماں قلندر رانبا شد علم و ایقاں
قلندر رانبا شد آرزوئے قلندر رانبا شد تار موئے
قلندر از ہمہ مذہب برداں است قلندر راندہ کس کہ چو است
قلندر رانبا شد، ہیچ دیجے قلندر انبا شد حرص و کینے
قلندر خرقہ از عشق دوزد قلندر خرقہ کونین سوزد
قلندر انبا شد وانتہائے قلندر رانبا شد ابتدائے

جب تک مسلک قلندری کو علم و عمل سے حاصل نہ کر لیا جائے اس وقت تک قلندر کے بارے میں اظہار خیال کرنا جہالت کے سوا اور کیا ہے؟

قلندر راندہ کس کہ چوں است

کیونکہ جس قلندری میں ہزاروں بال سے زیادہ باریک نکات پوشیدہ ہیں اُس کے بارے میں محض علمی موشگافیوں سے کام لے کر اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھنا کوئی اچھی بات نہیں بو علی شاہ قلندر کے یہ اشعار ان کے لفظی معانی ہر اس مذہبی ذہنیت رکھنے والے آدمی کو آمادہ دشنام طرازی کر سکتے ہیں جسمانی طبقے کی پست ترین نوع سے تعلق رکھتا ہے۔

ہر وہ شخص جو جسمانی ارتقا سے گذرتا ہوا ذہنی ارتقا میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتا اور اس کے بعد روحانی ارتقا کے واسطے جدوجہد نہیں کرتا اُسے انسانوں کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ ان پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ۔

اسی طرح جو لوگ اپنے آپ کو شاعر' ادیب اور مدیر وغیرہ کہتے ہیں اور وہ اہلِ حقیقت کے معیار کے مطابق قانونِ ارتقا پر عملدرآمد نہیں کرتے محض فانی' جذباتی یا جسمانی طبقے سے تعلق رکھنے والی نوع میں شامل ہیں خواہ بالالفاظ دیگر وہ ذہنی طبقے کی پست ترین قسم سے وابستہ ہوں۔

maablib.org

لٹریچر

مُفلس انسانوں کو اخلاقی ضوابط مت سُنا
اس نظامِ سیم و زر میں مذہب و اخلاق کیا
آج کے اخبار میں بھی کچھ نظر آتا نہیں
قتل و خوں، جنگ و جدل، چوری ڈکیتی کے سوا
(صائب عاصمی)

سرمایہ دار اور جاگیردارانہ سماج میں فنونِ لطیفہ کا بھی استحصال ہوتا ہے چنانچہ علم و ادب کے تمام اداروں اور شعبوں پر ایسے ہی عناصر مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے محدود اور غیر انسانی شخصی مفادات کا تحفظ کر سکتے ہوں فن کاروں کا ذہن خرید لیا جاتا ہے اُن کا قلم بک جاتا ہے اور انہیں اسی صورت میں معاوضہ دیا جاتا ہے کہ وہ مذہب اخلاق اور آرٹ کے پردے میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کے آئینہ دار نظام اور جملہ حکمران طبقے کا اس انداز میں پروپگنڈا کریں۔ کہ جہال کے دلوں پر ان کی قومی اور عوامی خدمات کا تاثر قائم ہو جائے اور الیکشن کے مواقع پر ان سے ووٹ حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ اخبارات اور ایڈیٹر خرید لئے جاتے ہیں آرٹ کی سرپرستی کے نام پر فن کاروں کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ نظامِ سیم و زر کے معاشرے میں فن کاروں اور ''دانشوروں'' کا خرید لیا جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

اربابِ فن کا تخیل تک بک جاتا ہے زبان، ادب، ثقافت کے اداروں میں ''جی حضور دیئے'' داخل ہو جاتے ہیں۔ جو اپنی جماعت اپنے ہم خیال اور چاپلوس لوگوں کے سوا اور کسی کو اندر گھسنے ہی نہیں دیتے۔ اور اگر کوئی جیالا فن کار کوئی ایسی کتاب مارکیٹ میں لاتا ہے جو پڑھے لکھے جہلا کو خبردار کرتی ہے تو اس نظام کے پروردہ لوگ جو جہالت مآب ہوتے ہیں نقا

دہن کر تنقید نہیں بلکہ تنقیص کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ کتاب کسی نکتہ نگاہ سے بھی وقیع اور قابلِ مطالعہ نہیں۔ حالانکہ اس قسم کے نقاد انتہائی تنگ دل اور کمین اور جاہل ہوتے ہیں مگر صداقت کی آواز دبائی نہیں جا سکتی کیونکہ صداقت کے وہ بیج نمودار ہو کر بعینہٖ برگ و بار لاتے ہیں جو سچے فنکار خاموشی اور بے چارگی کے عالم میں دبو چے جاتے ہیں فنِ تنقید اُردو ادب میں تو نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ یہ فن انگریزی زبان میں اپنے تمام محاسن کے ساتھ موجود ہے مگر مزاج کے اعتبار سے اردو پر بہت کم منطبق ہو سکتا ہے کیونکہ زبانیں اپنا اپنا مزاج رکھتی ہیں جس کا تعلق اپنے ملک کی آب و ہوا بود و باش اور محلِ وقوع سے ہے اور اسی کے مطابق باشندوں کا لب و لہجہ بنتا ہے۔

اُردو ادب میں تنقیدی فن کے ابتدائی بانیوں میں محمد حسین آزاد ہیں ان کے بعد عرصہ تک کوئی مردِ میدان نظر نہیں آتا۔ پھر سید محی الدین زور قادری ایم اے پی ایچ ڈی اور مولانا عبدالحق دکھائی دیتے ہیں اور ساتھ ہی نیاز فتحپوری کا نام بھی نظر آتا ہے اور اصل فن تنقید کے اصولوں سے بے خبر ہر کسی کتاب پر تبصرہ لکھنے کی جرأت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سچے اور جھوٹے موتیوں میں امتیاز کا ذوقِ سلیم نہ رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو جوہری سمجھ کر موتیوں کو کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ جھوٹے اور سچے موتیوں میں کوئی تمیز نہیں کر سکے گا۔ مگر جوہری ہونے کے زعم میں تمسخر انگیز ظالمانہ رویہ اختیار کرے گا بس یہی بات اُن لوگوں پر صادق آتی ہے جو اپنے آپ کو نقاد سمجھ کر کسی کتاب پر تنقید کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

نقاد کے لئے اُن مناسب اوصاف کا مالک ہونا ضروری ہے جن کے بغیر وہ حقِ تنقید ادا کرنے کے قطعی نا اہل ہیں۔

(۱) اُسے لٹریچر کی تمام انواع کا پورا علم ہونا چاہیے۔

(۲) اس کی نظر میں وسعت کا ہونا ضروری ہے جو فکر و نظر کے عمیق کا مطالعہ کی پیداوار ہے۔

(۳) اُسے نظم و نثر کے بنیادی اصولوں اور قاعدوں سے پوری طرح باخبر ہونا چاہئے

(۴) اُس کے پاس اپنے اعتراضات یا تائیدات کے جواز کے لئے منصفانہ دلائل

اور ان دلائل کی صداقت کے لئے حوالے اور سندات کا ہونا ضروری ہے۔

(۵) اُسے تنقید اور تنقیص میں امتیاز قائم کرنا چاہیے۔

(۶) اُس کا انداز تحریر طنز و تمسخر سے قطعی پاک ہونا چاہیے۔

(۷) اُس میں فن کار کی ذہنی اور شعوری سطح تک پہنچ کر اُسے کما حقہٗ سمجھنے کی صلاحیت ہونا چاہیے۔

(۸) اُس کی قوت فیصلہ بصیرو بصارت کی آئینہ دار ہو۔

(۹) اُس کا نظریہ وسیع پسند اور ترقی یافتہ ہونا لازمی ہے

اگر نقاد میں متذکرہ الصدر اوصاف نہیں تو وہ نقاد نہیں بلکہ جلاد ہے یا قصاب۔ اور اُس کے ہاتھ میں قلم نہیں بلکہ کند چھری ہے وہ جہالت کو علم سمجھتا ہے وہ نہایت برخود غلط اور خود فریب واقع ہوا ہے اس قسم کا شخص لٹریچر کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

چونکہ اُردو زبان میں فنِ تنقید کا فقدان ہے اس لئے آئے دن کیڑوں مکوڑوں کی طرح رسالے، اخبار اور کتابیں شائع ہو رہے ہیں جن میں سے اکثر تہذیب و معاشرت کے لئے مہلک ہیں اکثر مدیرانِ جرائد و رسائل ادارت کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ ان میں جانبداری کے ساتھ ساتھ تنگ نظری اور تنگدلی کے اوصاف ہیں جو علم و ادب کی خدمت تو کیا کرسکتے ہیں نام و نمود کے جذبے سے ملوث ہیں وہ گھٹیا اور سستی شہرت کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔

حالانکہ ایڈیٹر کے لئے مندرجہ ذیل اوصاف کا مالک ہونا لازمی ہے۔

(۱) اُسے جدید و قدیم علمی و ادبی اور سیاسی تقاضوں سے کما حقہٗ باخبر ہونا چاہیے کیونکہ علم و ادب اور سیاست ایک ہی جزو کے تین نام ہیں، جن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ادب (لٹریچر) کو سیاست سے کیا کسی رجحان سے بھی کنارہ کش رکھنا ایک احمقانہ کوشش ہے کیونکہ موجودہ دور کا انسان کنوئیں کا مینڈک بن کر رہنا نہیں چاہتا وہ اخبارات کے ذریعہ پوری دنیا ئے روزمرہ حالات و کوائف سے باخبر ہے۔ اور بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ میں دلچسپی رکھنا چاہتا ہے وہ تمام دنیا کے دانشوروں کو اپنی برادری سمجھتا ہے ہر ملک

میں تمام دنیا کے سفیر موجود ہیں اور جس طرح کوئی ملک عالمی سیاست' تجارت اور ثقافت وغیرہ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتا۔اسی طرح موجودہ زمانے کا کوئی شخص عالمی رجحانات سے پہلو تہی نہیں برت سکتا۔

اس دور میں تجارت بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی ہے سفر اور سیاحت بھی آفاقیت کے دور میں داخل ہیں چنانچہ ہر شخص کو دوسرے ممالک کے لوگوں سے دوستی اور تعاون قائم کرنے کے مواقع حاصل ہیں اور مبادلہ زر کی طرح مبادلہ افکار بھی آسان ہے ہر قسم کی درآمد و برآمد کی طرح خیالات وافکار کی درآمد برآمد بھی حیرت ناک طور پر جاری ہے سفیروں کے تبادلے کی طرح خیالات وافکار کی درآمد و برآمد بھی حیرت ناک طور پر جاری ہے سفیروں کے تبادلے کی طرح خیالات وافکار کا تبادلہ بھی روز افزوں ترقی پر ہے الغرض اس سائنٹفک دور میں اگر کوئی شخص اپنی ڈفلی اپنا راگ'' کا نظریہ اپنانے کے خواب دیکھے تو اس کے یہ خواب دیوانے کے خواب تو ہو سکتے ہیں مگر حقیقت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔مختصراً دنیا اپنی حدیں توڑتی جارہی ہے فاصلے گھٹتے جارہے ہیں جب ارضی زمان و مکان کا یہ عالم ہے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ سماوی زمان و مکاں تو پہلے ہی لامحدودیت کی اقلیم نور سے ہمکنار ہیں تو اگر اہل قلم کے ذہنوں میں حدیں ہوں۔تو ظاہر ہے کہ ایسے اہل قلم انسانیت کے لئے زہرناک جراثیم تو ہو سکتے ہیں انہیں صحافی، فن کار اور نقاد کہنا نہ صرف لٹریچر کی بلکہ انسانیت کی توہین ہے۔

(۲) اُس کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہونا چاہیے۔

(۳) اُس کی شخصیت میں مقناطیسی کشش کا ہونا ضروری ہے

(۴) اُس کی گفتگو میں علم، حلم، متانت اور دلائل ہونا چاہئیں۔

(۵) اُس کے لہجے کے پس پردہ دانائی، اخلاق اور ذہانت کارفرما ہوں۔

(۶) اُس کا انسان دوست ہونا ضروری ہے۔

(۷) اُس کا قلم قیود کا متحمل نہ ہو۔

(۸) وہ عصمت قلم کا محافظ ہو۔

(۹) اُسے جدید ترین موضوعات (Current Topics) پر دسترس حاصل ہو

(۱۰) اصول پسند اور با اُصول ہو۔

(۱۱) اُسے کوئی خرید نہ سکے

(۱۲) کسی کا دست نگر نہ ہو۔

(۱۳) اس میں اوچھا پن نہ ہو۔

(۱۴) خوشامد اور تملق سے ماورا ہو۔

(۱۵) اُس کا محاکمہ اور قوتِ فیصلہ مستند ہو۔

اِن اصولوں کی روشنی میں مدیرانِ شمیر اپنے آپ کو پرکھ سکتے ہیں۔

☆☆☆

maablib.org

ترقی پسندانہ تحریک

بلندیوں کی تمنا کرو نہ بھولے
معاشرے میں ہے اک جرم ارتقائے شعور
گلوں سے دامن ہستی بھرو نہ بھولے سے
کہ غم کے کانٹوں سے لبریز ہے فضائے شعور
(صائب عاصمی)

یہ تحریک اپنے نام سے اپنی صفات کا پتہ دیتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک نے تنوع اور ارتقاء کی بنیادوں پر متعدد بہت اچھے اچھے فنکاروں کو جنم دیا ہے جو روایات سے منحرف ہو کر تعمیر و تخلیق کے اصولوں کو زندگی کا نصب العین بناتے ہیں اس تحریک سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کے شہکار شدت تاثر' جذباتیت اور احساس کے ترجمان ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جذبات واحساسات اور اُن کی شدت کا تعلق ذہن سے ہے انسان کا ذہن اس کی جسمانی زندگی تک محدود ہے موت کے بعد ذہن ختم ہو جاتا ہے اور ذہنی زندگی کا عمل ورد عمل شروع ہو جاتا ہے متعدد ترقی پسند ادیب اور شاعر روحانی زندگی کو تسلیم نہیں کرتے وہ تصوف اور دیانت کو بھی کوئی گلی سڑی شے سمجھتے ہیں حالانکہ انہوں نے اس کا خلوص کے ساتھ مطالعہ کیا ہی نہیں ہوتا کیونکہ حقائق کبھی مردہ نہیں ہوتے ان کے لئے ماضی حال اور مستقبل یکساں حیثیت رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ محدود شعور رکھنے والے لوگوں نے روحانیت تصوف اور ویدانت کو بھی جاگیرداری اور سرمایہ داری کی طرح اجارہ بنا لیا۔ بلکہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کی پشت پناہی کے لئے اسے استعمال کیا جاتا رہا حالانکہ مذہب اور روحانیت میں زمین آسمان کا فرق ہے مذہب جہال کے ذہنوں کی پیداوار ہے اور روحانیت صداقت شعار لوگوں کی تخلیق ۔ محض جذباتیت اور حساسیت کے زندان میں

گرفتار رہتا اور بزعمِ خویش جذبات و احساسات کا ترجمان بنا دائمی مقصدِ حیات نہیں۔

وقت بدلتا ہے اور موسم بھی زمان و مکان تغیر پذیر ہیں وقت اور موسم کے ساتھ ضروریاتِ زندگی بھی تبدیل ہو جاتی ہیں ماضی مر چکا اور اس کی موت اس لحاظ سے ہے کہ سائنسی تقاضے بھی نئے ہو گئے ارتقائی کیفیات بھی پیدا ہو گئیں اور تنوع کے تقاضے بھی ابھر آئے اس نکتہ نگاہ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے عناصر ترکیبی مستحق ستائش ہیں جنہوں نے ماضی پرست لوگوں کو بتایا کہ وہی ادب جاندار ہے جس کی بنیاد زندگی کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے تقاضوں پر ہے محض عروض و قافیہ کی جکڑ بندیاں فن کا سرمایہ اظہار نہیں۔ کیونکہ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والے کوہ پیماؤں کو تو شاید اپنی مہمات میں دلکشی اور جاذبیت دکھائی دیتی ہوگی مگر قافیہ پیمائی میں تو ذرہ بھر دلکشی اور دلچسپی نظر نہیں آسکتی۔

سب سے زیادہ ترقی پسند فنکاروں نے لا مذہبیت پر زور دیا ہے اور یہ ایک انتہائی مستحسن اقدام ہے کیونکہ مفروضہ اور مبینہ مذاہب نے انسان کے ذہن کو پابندِ سلاسل بنا کر رکھ دیا ہے اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ مذہبی دنیا نے گذشتہ کئی صدیوں سے کوئی ایجاد نہیں کی۔ جو تہذیبِ انسانی کو چار چاند لگا دے۔ اس کے برعکس تہذیب و تمدن کو مالا مال کرنے والے وہی فنکار اور موجد ہیں جن کا مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ چنانچہ ساری دنیا کے مذہبی لوگوں کے مقابلے میں ایسا ہی ایک جینئس فن کار لائق پرستش ہے جس نے اپنی ذہنی تخلیقات سے تہذیب و ثقافت کو حیرتناک جلا بخشی۔

ان ترقی پسند مصنفین نے بھی لٹریچر کو اپنی فطری ذہانتوں اور ذاتی جوہروں سے مزین کیا۔ اور اس کے گلزار کی اپنی جانفشانیوں سے آبیاری کی کیونکہ معاشرۂ انسانی کی تخلیق میں فن کاروں کا نمایاں اور امتیازی حصہ ہے۔ لیکن جذباتیت اور حساسیت کا عبوری دور گذر جانے کے بعد جب ٹھہراؤ پیدا ہوگا تو ان فنکاروں کی وہ تخلیقات جن کی بنیاد محض شدتِ احساس پر ہے سرد پڑ جائیں گی بے شک عبوری دور کے لئے ان کی ضرورت ہے لیکن مستقبل میں جب ایک آفاقی معاشرہ کی بنیاد پڑ جائے گی تو ان کی تخلیقات بھی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جائیں گی۔

☆☆☆

ایک ایڈیٹر کے نام

محترم ایڈیٹر صاحب! آپ نے "ادبی دنیا" کے نومبر اور دسمبر کے شمارے میں جناب صائب عاصمی ایم اے (نفسیات) کے ایک مجموعہ کلام نئی تخلیق پر جس غیر ذمہ دارانہ اور سوقیانہ انداز سے تبصرہ کیا ہے وہ ایک مدیر شہیر کے شایانِ شان نہیں کیونکہ میں اور میرے دوستوں نے نئی تخلیق کا بہ نگاہ عمیق مطالعہ کیا ہے ہمیں تو جو فلسفے نفسیات اور ادب کی طالبات ہیں اس میں ایک خاص اور منفرد نظریئے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا اور وہ نظریہ نظریہ توحید معرفت ذات اور عرفان وخود آگاہی ہے چونکہ مذاہب کی متبدیانہ اور مصلحت اندیشانہ رسوم نے معرفت ذات کے علم پر جہالت کا دبیز پردہ ڈال رکھا ہے اس لئے ہم ذات تعصب تنگ دلی اور تنگ نظری کی نذر ہو کر رہ گیا ہے مگر صائب عاصمی صاحب نے براہ راست قلندرانہ ادا سے اپنے اس نظریہ کو جس رنگ میں پوری کتاب میں بیان کیا ہے۔ اُس کا سمجھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ جسے اُنہوں نے علم وعمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ظاہر کیا ہے کیونکہ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت صائب ایک کامل اور افعال روحانی ہستی ہیں۔ اور نے آپ یہ بالکل کج فہمی کی بنا پر تحریر فرمایا ہے کہ وہ دنیا سے اُکتا کر کچھ عرصہ کے لئے گوشہ نشین ہو گئے تھے اور یہ بھی بالکل لاعلمی ہی کی بنیادوں پر ہے کہ انہیں تنہائی میں بھی سکونِ قلب حاصل نہ ہو سکا یہ بھی سراسر حماقت پرمبنی ہے کہ وہ پریشان اور پراگندہ خیالات کے مالک ہیں اور نئی تخلیق میں اُن کا ذہنی انتشار جھلکتا ہے نیز وہ ماہر نفسیات ہونے کے باوجود خود نفسیاتی اُلجھنوں میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں وہ تو اب بھی تارک الدنیا ہیں دنیا میں رہتے ہوئے اور دنیا کی گہما گہمیوں سے دلچسپی لیتے ہوئے بھی تارک الدنیا ہیں "نئی تخلیق" میں بھی یہ بات کہیں نہیں جھلکتی کہ انہیں دنیا سے نفرت ہے بلکہ اس سے ان کی انسان دوستی احترام آدمیت اور فطرت پرستی بدرجہ اتم واضح ہے چونکہ روحانی کمال دانش جو عملی

دریافت سے تعلق رکھتا ہے مقدس الحادی کے انکشاف پر منتج ہوتا رہا ہے اس لئے عاصی صاحب واقعی مذہب کو نہیں مانتے اول تو یہ اس کا باعث یہ ہے کہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا اخلاق منافقانہ اور ریاکارانہ ہے دوسرے مذہب سے متعلق اشخاص محدودیت میں اس بُری طرح اُلجھے ہوئے ہیں کہ اُن کا طرزِ عمل ان کی دینداری کے ڈھول کا پول کھلتا ہی رہتا ہے تبصرہ نگار بہت کم علم، تنگ نظر اور سطحیت پسند شخص معلوم ہوتا ہے اُس نے نئی تخلیق کو پڑھا بھی نہیں۔ اور اناپ شناپ ریویو کر دیا۔ حالانکہ ریویو کرنا ایک انتہائی ذمہ دارانہ عمل ہے مگر اس نے ادبی دنیا کے قارئین کو یہ انتہائی غلط تاثر دے کر ایک ایسی ادبی بددیانتی کا ارتکاب کیا ہے جسے آسانی کے ساتھ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ عاصی صاحب زندگی کی مثبت اقدار، حیات کے قائل ہیں مگر ریاکاری اور منافقت برداشت کرنے کے لئے ایک لحظہ بھی تیار نظر نہیں آتے۔ اُن کا مذہب فقط محبت اور پیار ہے ایک رُوحانی انسان کے بارے میں اس قسم کی باتیں لکھنا ایک اخلاق سوز جسارت بیجا ہے کیونکہ اس قسم کی عامیانہ سطحی اور متعصبانہ حرکات مذلوجی کا مرتکب انسان جو دل آزاری کا موجب ہوتا ہے یقیناً آفات ناگہانی کا شکار ہو جاتا ہے اور اگر وہ اپنا محاسبہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کرے تو اپنی اس ذہنیت کے طفیل پہلے ہی گوناگوں آفات و بلیات میں گرفتار ہوتا ہے اور اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس تبصرے کے اپنے حالات کا جائزہ لیتے جائیں آپ کا انجام بھی اُن بے شمار لوگوں کی طرح ظہور پذیر ہو سکتا ہے جنہوں نے عاصی صاحب جیسے بے لوث انسان کا دل دکھایا اور کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔

فن کو سمجھنے کے لئے فن کار کا سمجھنا نہایت لازمی امر ہے اور عاصی صاحب ایسے فن کار کا سمجھنا بازیچہ طفلاں نہیں! اگرچہ ''نئی تخلیق'' کے خلاف لکھنے کی وجہ سے عاصی صاحب کی عظیم اور بے لوث شخصیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ ایسے جینئس فن کاروں کی مجموعی مخالفت بھی فطرتاً اُن کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کا باعث ہوتی ہے یہ ضروری ہے کہ عاصی صاحب نے اپنے نظریات کو اُوٹ پٹانگ آزاد شاعری' کی مضحکہ خیز تکنیک کے ذریعہ بیان نہیں کیا۔ اور اس ذلیل صنف کا ترجمان آپ کا رسالہ ہے حالانکہ آزاد شاعر اُردو زبان کے

لطیف مزاج کے منافی ہے کیونکہ اُردو شاعری ترنم اور تبسم کی آئینہ دار ہے اور عاصمی صاحب کی تمام تر شاعری میں حلاوت' فصلات' تبسم اور ترنم موجود ہے مگر آپ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کس بددیانتی کے جذبے سے لکھ دیا ہے۔ کہ ان کے اکثر اشعار میں وزن و زبان کی غلطیاں بھی کچھ کم نہیں اور ایسے اشعار نظر آتے ہیں جنہیں اچھا کہا جا سکے" اور آگے چل کر تحریر کیا ہے" آپ اپنے اشعار میں جگہ جگہ معاشرتی روایات' مذہب اور اخلاقیات کے خلاف اعلانِ جنگ فرماتے ہیں" پھر لکھا گیا ہے "ان کے پاس شاعری کے لئے کوئی خاص موضوع ہے اور نہ کوئی خاص اسلوب رکھتے ہیں" کہ "یہ بات لکھتے ہوئے نہایت ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ "نئی تخلیق" میں ایک جگہ عاصمی صاحب نے علامہ اقبال پر بھی بڑے بھونڈے انداز سے تنقید کی ہے۔

چنانچہ ان باتوں سے ہر باشعور قاری پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ۔

(۱) نقاد روایت پرست بھی ہے اور اقبال پرستی میں بھی غلو کی حد تک مبتلا ہے۔

(۲) وہ علم ذات سے قطعاً بے بہرہ ہے۔

(۳) وہ پڑھا لکھا جاہل معلوم ہوتا ہے اور خود غلط قسم کے لوگوں میں سے ہے۔

(۴) اُس نے سرسری طور پر یہ دیکھ کر یہ "نئی تخلیق" میں عاصمی صاحب نے معاشرتی روایت، مذہب اور اخلاقیات کے خلاف اعلانِ جنگ فرمایا ہے" پوری کتاب کو ناقص قرار دے کر بزعمِ خویش اپنی "فاضلانہ عظمت" کا ثبوت دیا ہے حالانکہ اُس کا یہ نہایت غیر معقولی تبصرہ اُس کی ذہنی پستی کی پوری پوری غمازی کر رہا ہے کہ اُس نے یہ تبصرہ مزعومہ اور مفروضہ عداوت کے جذبے سے کرنے کی گستاخانہ جرأت کی ہے۔

جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے وہ تو اس تبصرے سے ہی ظاہر ہے کہ کسی صاحب قلم مدیر کا اخلاق کیا ہے؟ عاصمی صاحب نے "نئی تخلیق" میں "فلسفہ جنسیات" پر روشنی ڈالی ہے اور نفسیات کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جنسیات کو ہم اپنی زندگی سے خارج کر دیں تو زندگی گورستان بن جاتی ہے کیا تبصرہ نگار کو یہ معلوم نہیں کہ رومی اور بے شمار دیگر عارفانِ حق نے کس عریاں اور فحش انداز سے انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کی ہے۔

مثلاً مثنوی کی "کیرِ خسر راوید کدورانہ دید" کی منظوم حکایت، گلستان سعدی کا پانچواں باب "در باب عشق و جوانی" اردو زبان کے شعرائے متاخرین کی عریاں نگاریاں اور اُن کی مرد پرستی کے شاعرانہ خیالات حالانکہ عاصی صاحب نے اپنی فلسفہ جنسیات سے تعلق رکھنے والی نظموں میں مقصد تخلیق فطرت کی نہایت دلکش انداز میں ترجمانی کی ہے۔ جس سے مرد پرستی ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ قانون فطرت کا غیر مشروط احترام جھلکتا ہے اسی طرح اُن کی ایک طویل نظم "معصومیت" ہے۔ جس میں ایک بے لوث فنکار کی یہ کوشش ہے کہ معاشرہ انسانی تعمیر و تخلیق کے فطری اُصولوں پر مرتب ہو اس میں انہوں نے انسان کی زندگی بتائی ہے کہ جب بچہ جوان اور بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنے ماحول کا علمبردار ہوتا ہے اگر وہ گناہگار ہے تو یہ بھی ماحول ہی کا قصور ہے اور اگر وہ مرد نیک ہے تو یہ بھی ماحول ہی کے باعث ہے مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے کیونکہ معاشرے کی منافقانہ سازشیں اُسے اپنی طرح بنا دینے پر مجبور کرتی ہیں لوگ مذہب پرست ہوتے ہیں اور مذہبی ذہنیت بھی ورثے میں حاصل کرتے ہیں مگر وہ تحقیق و تخلیق سے نسلاً بہ نسلاً معزرا رہتے ہیں کیونکہ مذہب کی روایتی تعلیم اُن کے ذہنوں کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ اور شعور کو محدود و مقید رکھتی ہے۔ ان کے دلوں پر "شاندار جہالت" کے تالے لگا دیتی ہے جسے وہ علم و فضل کہتے ہیں۔ عاصی صاحب کہتے ہیں!

جو فرصت ذرا ملتی دنیا کے غم سے
تو کار نمایاں انجام دیتے
ادب میں نئی طرح اک ڈال دیتے
نیا ایک انسان کو پیغام دیتے

تو کیا قباحت کی ہے؟ کیا یہ بات بے شمار فطری فنکاروں کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کرتی جو اقتصادی مشکلات سے تنگ آ کر بالآخر خودکشی کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر انہیں اقتصادی آسودگی حاصل ہو تو اپنی تخلیقی ذہانتوں سے ادب کو مالا مال کر دینے کے قابل ہیں مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہر شعبہ حیات میں کھوٹے سکے اہمیت رکھتے ہیں "نئی تخلیق" اپنے نام کی مناسبت سے بھی نئی تخلیق" ہے اگر آپ اسے دوبارہ پڑھیں گے تو شاید

آپ کو اس میں وہ محاسن نظر آ جائیں جن کی وجہ سے حضرت صائب عاصمی مستقبل کی باشعور سماج کے لئے ایک منفرد مقام کے مالک دکھائی دیتے ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ میرے تمام خط کو من وعن ادبی دنیا کے اگلے شمارے میں نمایاں طور پر چھاپ کر مدیرانہ فرائض مفوضہ کا کما حقہٗ احساس کریں گے ذمہ داریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے ورنہ میں بہانگ دہل کہہ سکتی ہوں۔ کہ ادبی دنیا کا بھی دم اخیر ہے اور آپ کا بھی نقصان عظیم سے دوچار ہو کر کیفر کردار کو پہنچنے والے ہیں اور یہ بات تو ملک کا ہر ادبی حلقہ جانتا ہے جو فی الواقع بلند معیار کا مالک بھی ہو کہ ''ادبی دنیا'' کا معیار روز بروز گر رہا ہے یہ اور بات ہے کہ اپنی چیزیں چھپوانے کی خاطر مبتدی قسم کے ادباء اور شعراء ایڈیٹر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور بے چارے کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

کیونکہ جس شمارے میں ''نئی تخلیق'' پر تبصرہ چھاپا ہے اسی میں اس قدر پست مزاقی نظر آتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہی رسالہ ہے جس کے روایتی نام کی آڑ لے کر استحصال کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ جس میں نہایت پست معیار کے حامل مندرجات دکھائی دیتے ہیں جن میں زبان اور فن کی اقدار کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے غزلوں کا معیار نہایت پست ہے اسی طرح نظموں میں بھی فن کی بلندیاں موجود ہیں اکثر مقالات اچھے ہیں بالخصوص کرم حیدری کا مقالہ ادب کی دوامی ایک بہترین معیاری کاوش ہے افسانوں کا معیار بہت پست ہے میں حیران ہوں کہ شخصیت پرستی کا مہلک عارضہ کب دور ہو گا؟ ہر شمارے میں مولانا صلاح الدین کے بارے میں برابر اُن کے گن گائے جانے سے بوریت پیدا ہونے لگتی ہے میری کئی دوست رسالہ ادبی دنیا کی کئی برس سے خریدار ہیں اور ان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر آپ نے نئی تخلیق کے بارے میں شائع شدہ تنقیص کی تردید نہ کی بلکہ ایسے رسائل و جرائد کا مقاطعہ کرنے کی غرض سے اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں گی کیونکہ یہ ایک اخلاقی اور ادبی بددیانتی ہے کہ ایک ایڈیٹر غیر ذمہ داری کے ساتھ کسی فنکار یا روحانی شخصیت کے بارے میں غلط سلط لکھ کر اپنے قارئین کو یہ غلط اور بھونڈا تاثر دینے کی جسارت کرتا جائے کہ اس

کے کلام میں ایک شعر بھی اچھا نہیں بلکہ اُس کے رسالے میں شاذ و نادر ہی اچھی چیزیں شائع ہوتی ہوں اور خود اُس کا اپنا کوئی ادبی مقام نہ ہو۔ بلکہ محض اقبال پرستی کے عارضہ میں مبتلا رہ کر اُس کے متعلق وہ مواد شائع کر کے مولف اور مصنف بننے کے خبط میں بھی گرفتار ہو۔ جسے خود اقبال اپنی زندگی میں شائع کرا کے اپنی مذعومہ شخصیت کے لئے باعث عار محسوس کرتا تھا کیونکہ اُس کے ایسے کلام کا چھپنا اُس کی زندگی کے تعلق پسندانہ پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرنے کا وسیلہ ثابت ہو رہا ہے۔

کیا واقعی آپ اس طویل خط کو کسی پس و پیش اور بد دیانتی کے بغیر شائع کر دیں گے۔ اگرچہ مجھے کسی تنگ دل انسان سے اس بات کی توقع نہیں ہو سکتی۔ کہ وہ ایسا کر سکتا ہے اگر چہ آپ کی وسیع النظری اور قابلیت کے مداحوں کا بھی غالباً کوئی حلقہ وجود ہے کیونکہ "ادبی دنیا" کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے غالباً تنگ نظر لوگوں کی وسیع النظری اور عالی ظرفی کا معیار بھی طرفہ تر ہے۔

عاصی صاحب کا تصوف کتابی یا اکتسابی نہیں بلکہ فطری نمو پر مبنی ہے۔ جس کا تعلق نظری و عملی تحقیق ہے جدید ترین تخلیقی خیال بھی عروض و قوانین کی پابندیوں میں رہ کر ظاہر کیا جا سکتا ہے اور عاصی صاحب نے یہی کیا ہے اور ایک لغو قسم کا ادبی رسالہ ان کے بارے میں بھونڈا پروپگنڈا کرنے کی جاہلانہ جسارت کرے کہ "نئی تخلیق" میں کچھ نہیں اور اشعار ساقط لوزان ہیں بہت تاسف انگیز بات ہے جبکہ وہ اپنی دیدہ دلیری کے جواز دلائل بھی پیش نہ کرے ۔ بلکہ خود اُس کے رسالے میں جو مندرجات شائع ہوتے ہیں وہ رطب و یابس، بے معنی اور سقیم ہوتے ہوں۔ فی الواقع "نئی تخلیق" جہالت ماٰب عناصر کے لئے ایٹم بم ہے کیونکہ نیا اور تخلیقی خیال ہمیشہ ہی صدمہ رساں ہوتا ہے۔

راقمہ

پروفیسر نگہت سلطانہ ایم اے

صائب عاصمی کا آفاقی انسان

از حضرت اکبر حمیدی

مرزا غالب کے دور تک اُردو شاعری بحیثیت مجموعی زلف ورخسار کی شاعری رہی ہے جسے اپنے ماحول، معاشرے اور اس کے مسائل سے کوئی علاقہ نہیں تھا اس دور میں انسانیت کے مجموعی مفادات اور آفاقیت کا کوئی نمایاں تصور نہیں ملتا تھا اور تو خود مرزا غالب جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر کا خونی دور اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں انسانوں نے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ وہ اس رنگ سے متاثر نہیں ہوئے کہ ان کے تاثرات کو آفاقی کہا جاسکے ان کے تمام شعری تاثرات اس شعر کے محور کے گرد گھومتے ہیں۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

انہوں نے دلی کی تباہی اور انسانوں کی بربادی کو شخصی نقطہ نظر سے محسوس کیا ہے محض اس لئے کہ کوئی ان کا اُمید گاہ تھا کوئی شفیق کوئی دوست کوئی یار کوئی شاگرد اور کوئی معشوق۔ یہاں میں مرزا صاحب کے ایک خط کی چند سطور نقل کرتا ہوں جو ان کے قلبی تاثرات کی آئینہ دار ہیں "انگریز قوم میں سے جوان سیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں سے کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار۔ اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستان میں کچھ عزیز کچھ دوست۔ کچھ شاگرد۔ کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکہ نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہیں ہوگا"۔

غدر کے بارے میں مرزا صاحب کے اور بھی خطوط ہیں جو کم وبیش انہیں احساسات پر

مبنی ہیں غدر کے موضوع پر مرزا کی تصنیف "دستنبو" سے بھی ان کا شخصی تاثر ملتا ہے اور یہ تاثر بھی ان کے خطوط اور "دستنبو" تک محدود ہے شعر میں سوائے ایک دو غزلوں اور ایک نظم کے یہ تاثر کہیں نہیں ملتا لیکن شخصی نقطہ نظر سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہزاروں لاکھوں انسان گاجر مولی کی طرح کٹ گئے مگر اس دور کے عظیم ترین شاعر کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ ذاتی جذبات کے حادثے میں اس عظیم المرتبت شاعر کی انگلیاں فگار ہو سکتی ہیں خامہ خونچکاں ہو سکتا ہے مگر اتنے انسانوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اترتے دیکھ کر اس کے سینے پہ ایک خراش تک پیدا نہیں ہوتی۔

نظیر اکبر آبادی کے ہاں محض مقامیت ہے حالی نے نہ صرف اپنی قوم کے زوال کا رونا رویا ہے اور اس کے لئے ایک بڑی چوڑی مسدس لکھ دی ہے مگر بنی نوع انسان کے لئے اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا امیر مینائی نے انسان درد کو بحیثیت انسان کے محسوس کیا ہے اور اس کے اظہار کے لیے صرف ایک مگر بھرپور شعر کہا ہے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دور جدید کے شاعر اقبال کے ہاں البتہ آفاقیت کا تصور ملتا ہے ان کا آدم خاکی تمام بنی نوع انسان کا نمائندہ ہے۔ جس کے عروج سے انجم سہمے جاتے ہیں۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل بن جائے

اقبال نے سب سے پہلے ہمیں ایک مرد آفاقی کا تصور دیا ہے جسے چین عرب شام یا روم سے کوئی واسطہ نہیں اور جس کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ دو عالم میں بھی سما نہیں سکتا۔

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

اپنے اس مرد آفاقی کو انہوں نے ایک عالمگیر محبت بھی دی ہے جو ترکی و تازی رسموں سے بے نیاز ہے۔

شہید محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہوں انداز آفاقی

لیکن بعض دوسرے نظریات کی طرح اقبال کا یہ نظریہ بھی اس کے ذہنی تضاد کا شکار ہو گیا وہ ایک طرف محبت کا درس دیتا ہے اپنے مرد آفاقی کو چینی' عربی' رومی اور شامی کے رشتوں سے بلند تر کر کے پیش کرتا ہے اس کی نگاہوں میں آفاقی انداز کی رنگ آمیزی کرتا ہے مگر دوسرے لمحے ہی وہ مسیح یعنی' نپولین' لینن' نادر شاہ اور تاتاریوں جیسے انسانیت کے قاتلوں کو اپنا آئیڈیل بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اقبال کے شاہین کو دیکھئے۔

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کا شاہین بھوکا نہ ہونے کے باوجود اور زاہدانہ زندگی گذرانے کے باوجود کبوتر پر محض اس لئے جھپٹتا ہے کہ اس کا لہو گرم رہے یہ نقطہ انسانیت کی نشوونما کے لئے کس قدر ہلاکت آفریں ہے محتاج بیان نہیں۔ اقبال کا شاہین ایک وحشی درندہ ہے جو محض اپنی خونخواری کی عادت کو پورا کرنے کے لئے ناتوانوں پر جھپٹتا ہے اقبال اپنے شاہین بچوں کو نصیحت کرتے ہیں۔

جو کبوتر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں نہیں

اقبال کے انہی تضادات کو پیش نظر رکھ کر سردار جعفری لکھتے ہیں کہ "یہ اقبال کا مستقل تضاد ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جس حسین و جمیل دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں ان کا فلسفہ دنیا کے تباہ کرنے والے افراد کی پیدائش میں مدد کرتا ہے۔

آج کے دور میں انسان برداری، نسل، رنگ، قومیت، مذہبیت اور وطنیت کے گروہوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور ہر گروہ دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہے آج کے سائنسی دور نے جہاں انسانی آسائش و آرام کے لئے لوازمات مہیا کئے ہیں وہاں نسل انسانی کی بیخ کنی کرنے کے لئے مہلک ترین ہتھیار بھی ایجاد کر دیئے ہیں آج جنگ کی وجہ ہوس ملک گیری نہیں بلکہ اپنی قومی برتری کا احساس اور طاقت کا نشہ ہے آج کی دنیا میں امن عالم کے لئے انسانی ذہن کو رنگ و نسل اور قومیت اور وطنیت کے تصور سے آزادی دلا کر اسے ایک عالمگیر بھائی چارے کی وحدت فکر پر لانا انتہائی ضروری ہو گیا ہے صاحب عاصمی نے اپنی تازہ تصنیف "نئی تخلیق" میں اسی نقطہ خیال کو پیش کیا ہے۔

ایک خدا اک نوع انسانی میں ہے جلوہ افروز
ایک عالمگیر بھائی چارہ ہے اس کو پسند

تمام انسان خدا کے پیدا کردہ ہیں اور وہ سب کو بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی نعمتوں سے نواز رہا ہے اس نے انسانوں کو رشد و ہدایت کے لئے جس قدر صحیفے نازل فرمائے ہیں کسی میں انسانوں کو انسانوں کا خون بہانے کی اجازت نہیں دی دنیا کا کوئی مذہب اپنے پیروکاروں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے اعتقادات زبردستی دوسروں پر ٹھونستے پھریں اور نظریاتی اختلاف رائے کرنے والوں کو تہ تیغ کر دیں خدا تعالیٰ نے اپنے کسی صحیفے میں دین کے معاملے میں زبردستی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ اس کے مظاہراتی صحیفے چاند، سورج، ہوا، پانی، آگ تمام بنی نوع انسان کی خاطر ہیں صاحب عاصمی کا شاعرانہ مگر بر حقیقت استدلال ملاحظہ فرمایئے۔

چاند سورج کا کوئی مذہب نہیں
اک بنی آدم ہے جو مسدود ہے

بادہ آب و خاک و آتش دیکھیے
فیض ان کا فیض لا محدود ہے

عاصی کے ہاں کسی کو رنگت' نسل' علم و دانش اور کسی بھی طبقاتی امتیاز کے باعث فضلیت حاصل نہیں ان کے نزدیک انسان کا اصل جوہر ہے۔

ہم تو انسانیت کے قائل ہیں
تم مہ و آفتاب ہو تو کیا

عاصی ایک سچا فن کار ہے وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہے خون دل سے لکھتا ہے وہ اپنے جذبات و احساسات کو بڑے سادہ اور خوبصورت اور موثر انداز میں پیش کرتا ہے یہ محض اس کے اسلوب اور انداز بیان کی دلکشی ہے کہ اس کے شعروں میں خطابت کا ناگوار رنگ پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک فنکارانہ خلوص اور سچا کرب جھلکتا ہے ملاحظہ فرمایئے وہ آج کے انسان کو دیکھ کر کتنا گھمبیر دکھ محسوس کرتا ہے۔

کتنا منحوس وقت آپہنچا
آدمی آدمی کا دشمن ہے

اور آدمی آدمی کا دشمن اس لئے ہے کہ اس نے اپنے آپ پر ہندو' سکھ مسلم وغیرہ کے لیبل لگا لئے ہیں اس نے اپنے نظریات و خیالات کو گروہ بندی کے کوزوں میں بند کر رکھا ہے اس نے اپنے فہم و ادراک کو محدود اور اپنی انسانی اکائی کو بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا ہے جس کی بنا پر اس کے مفادات اس کے حقوق اس کے طبقاتی دائرہ ہائے کار ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو چکے ہیں۔ آج کے ترقی پسند انسان کی یہ ماضی پرستی دیکھ کر عاصی نے کہا ہے۔

میں نہ ہندو ہوں نہ سکھ ہوں نہ مسلماں ہوں میں
جو پرستار ہیں ماضی کے وہ انساں تو نہیں
مذہبی تفریق سے قوموں میں ہے جنگ و جدل
مرتبہ انسانیت کا مذہبوں سے ہے بلند

آج کے انسان نے علم و دانش کا نہ ختم ہونے والا کتابی سرمایہ جمع کر رکھا ہے یہ وہی کتابی سرمایہ ہے جسے مولانا روم نے غرق آب کر دیا تھا کیونکہ جہالت کو دور کرنے کے لئے اور علم و دانش کو بچی روشنی حاصل کرنے کے لئے کتابیں کوئی مدد نہیں کر سکتیں اس لئے عاصی نے ''نئی تخلیق'' کے آغاز ہی میں یہ کہہ دیا ہے کہ اگر کتابیں جہالت دور کر سکتیں تو پڑھے لکھے لوگ جہال نہ ہوتے'' کتابیں معاشرہ کو خیرہ کر دینے والا تمدن تو دے سکتی ہیں مگر محبت کے قرینے نہیں سکھا سکتیں۔

وہ لبوں پر مسکراہٹ روشنی بکھیر دیتی ہیں مگر دلوں کے کینہ پرور اندھیرے دور نہیں کر سکتیں دیکھئے صاحب عاصی کتنے دکھ اور قلق سے اس کا اظہار کرتا ہے۔

نہ ہو جس میں محبت کا قرینہ
ڈبو دے اس تمدن کا سفینہ
یہی انسانیت ہے میرے اللہ
لبوں پر مسکراہٹ دل میں کینہ

عاصی نے اس دور کو جس آفاقی انسان کا تصور دیا ہے وہ ہر لحاظ سے انسان کامل ہے وہ تمام انسانوں سے بلا تمیز مذہب و ملت محبت کرتا ہے وہ تمام انسانیت کا نمائندہ ہے لیکن وہ آج کے ترقی پذیر دور کے تقاضوں کو دور کرنا بھی اپنی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتا ہے وہ کائنات کے رموز، سربستہ کو اپنے لئے ایک چیلنج تصور کرتا ہے وہ ایٹمی انسان ہے اور اپنی ترقی کی منازل کو راکٹ پر سوار ہو کر طے کرتا ہے وہ اپنے عہد کا خلا باز ہے وہ زمین پر رینگنے کی بجائے آسمانوں کی نیلگوں خلاؤں میں اپنی عظمت کے انمول نقوش ثبت کر رہا ہے۔

خلا باز راکٹ پہ اڑتا ہوا
حدود نظر سے گزرنے لگا
نیا ہے زمانہ نئی زندگی
کہ انسان ماضی کا مرنے لگا

عاصی کا انسانِ کامل ہی خدا تعالیٰ کا عظیم ترین شاہکار ہے وہ نرم دم گفتگو اور نرم دم

جستجو کے معیار پر پورا اترتا ہے وہ اپنے خالق کی صفات جلال و جمال کا مکمل مظہر ہے عاصی کے آفاقی انسان یا انسانِ کامل کو اس کے اپنے آئینۂ اظہار میں دیکھئے۔

قدرت کا اک حسین ترین شاہکار ہوں
میں ایٹمی زمانے کا پروردگار ہوں
دوڑیں رگِ حیات میں ایٹم کی بجلیاں
راکٹ میں جو سوار ہے وہ شہ سوار ہوں
میں سلسلۂ شام و سحر میں نہیں اسیر
محور ہوں میں زمیں کا فلک کا مدار ہوں
تخلیقِ کائنات ہے میرا اصول نو
تعمیر نو جو کا میں آئینہ دار ہوں
طوفان کا جلال ہوں بھونچال کا ہوں رعب
میں صاعقۂ برق سرِ کوہسار ہوں
میں مظہر حقیقت انساں ہوں بالیقیں
مسند فروزِ انجمن اقتدار ہوں
ہوں صاحبِ زماں کی حقیقت کا ترجماں
میں گنجِ لا زوال کا سرمایہ دار ہوں
ہے میری ذات مرکزِ تخلیقِ دو جہاں
مدت سے جس کا آپ کو تھا انتظار ہوں
میں ہی دوامِ زندگی سے ثبات ہوں
میں ہی ثباتِ ہستیِ ناپائیدار ہوں

عاصی کا انسانِ کامل ان سب باتوں کے باوجود بھی اپنی حیثیت کو تسلیم کروانے اور اپنے شخصیت کو متعارف کروانے کے سلسلے میں اپنے دور سے چنداں پر اُمید نہیں ہے اس کی وجہ اس کا اپنا احساس کمتری نہیں بلکہ اپنے مادہ پرست دور کی کم اندیشی اور

بصیرت کی بے نوری ہے۔

ہم جو آتے ہیں کوئی پہچانتا ہم کو نہیں
عاصی انسان کی قسمت کو رو جاتے ہیں ہم

اس قدر مطالعے کے بعد ہم عاصی کے آفاقی انسان کے خدوخال متعین کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں ہم اس کی داخلیت اور خارجیت کو الگ اور واضح انداز میں لکھتے ہیں۔

(۱) وہ ایٹمی دور کا انسان ہے اور ایٹم کے استعمال پر اُسے پوری قدرت حاصل ہے۔

(۲) وہ اپنے آپ کو انسانی کمال کا مظہر خیال کرتا ہے۔

(۳) وہ مسندفرزندا نجمن اقتدار ہے۔

(۴) وہ حقیقت اعلیٰ کا ترجمان ہے۔

(۵) وہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔

(۶) وہ غیر فانی ہے۔

(۷) وہ روئے زمین پر ایک عالمگیر بھائی چارہ قائم کرنا چاہتا ہے۔

(۸) وہ خدا تعالیٰ کو واحد اور لاشریک خیال کرتا ہے۔

(۹) اُس کے نظریات کے مطابق مذہب انسانی مہر و محبت کو فروغ دینے والے راستوں کو مسدود کر دیتا ہے۔

(۱۰) اس کے نزدیک انسان کا زیور انسانیت ہے۔

(۱۱) وہ دشمنی کے رجحانات کو منحوس خیال کرتا ہے۔

(۱۲) وہ قوم وطن، مذہب کے تصورات سے بالاتر ہو کر ایک بین الاقوامی معاشرہ تشکیل کرنا چاہتا ہے جہاں تمام انسانوں کا وطن ایک ہو۔ مذہب (انسانیت) ایک ہو۔

(۱۳) وہ اپنے اس معاشرے کو محبت، خلوص، نیکی اور ایثار کی بنیادوں پر تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

(۱۴) اُسے اپنے کمال۔ طاقت۔ عرفان کا شعور حاصل ہے۔

(۱۵) اُسے یقین ہے کہ اس کے نظریات میں اس دور کے تمام مسائل کا حل موجود

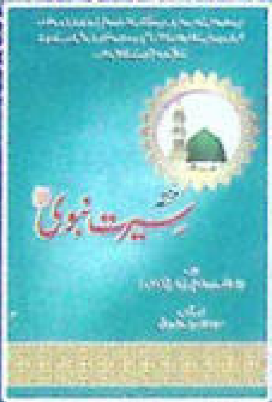
ہے۔ عاصی کا آفاقی انسان فی الحقیقت خودنگری اور خودشناسی کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہے۔

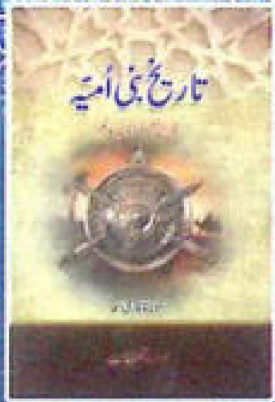
میں جو اپنے آپ کو پہچان لیتا ہوں کبھی
خود ہی اپنا قادر و مقدور ہو جاتا ہوں میں

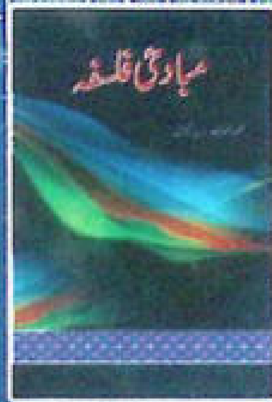
عاصی کا انسان ہر لحاظ سے مکمل ترین انسان ہے اگر آج کا دور اس کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور اس انسان کامل کی عظمت پر ایمان لے آئے تو انسانیت تباہی و بربادی کے مستقل خطرے سے ہمیشہ کے لئے نجات پا سکتی ہے۔

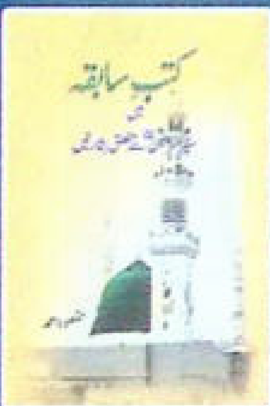
☆☆☆

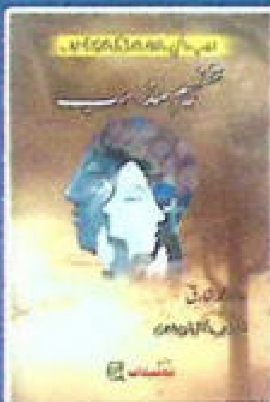
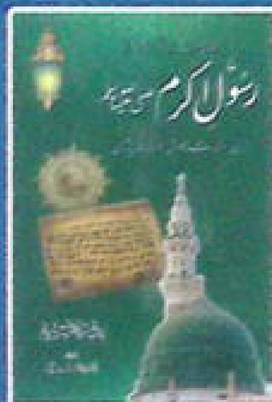
maablib.org















Stockist
BISMILLAH BOOK HOUSE
Urdu Bazar, Karachi.
Cell: 0312-2846175 Bismillahbookhouse